Regd. L. No.7243 Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1976

اس پرچہ میں

دنیا نظامِ محمدیؐ کے لئے بیتاب ہے

اگلے پرچہ میں

اقبالؒ اور مرکزِ ملت

(جس کے بغیر اسلام، اسلام ہی نہیں رہتا)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون	بدلِ اشتراک
۱½ ڈیڑھ روپیہ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور	سالانہ پاکستان ـــــ ۱۸ روپے غیر ممالک ـــــ ۲ پونڈ
نمبر ۴	اپریل ۱۹۷۶ء	جلد ۲۹

فہرست

۱۔ لمعات ـــــــــــــــــــ ۲

۲۔ دنیا نظامِ محمدیؐ کے لئے بیتاب ہے ـــ (محترم پرویز صاحب) ـــ ۹

۳۔ حقائق و عبر۔ (سو فیصد سے آگے) (مصطفیٰ اسلام) (تہذیبِ فرنگ) (ایام استبداد) (جنسی لذت سے بلند) (قوم کو دھوکے میں نہ رکھئیے) (یہ کہاں کی دوستی ہے؟) ۳۲

۴۔ مودودی صاحب اور علامہ اقبالؒ ـــــــــ ۴۳

۵۔ حیاتِ قائدِ اعظمؒ ـــــــــ ۴۹

۶۔ اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے! ـــــــ ۶۴-۶۱

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵-بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہم نے طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت اگست و ستمبر ۱۹۷۵ء کے لمعات میں اسلامی نظریاتی کونسل کے سلسلہ میں کچھ گزارشات پیش کی تھیں۔ اس ضمن میں ہم نے کہا تھا کہ یہ کونسل اور اُس کی ذیلی تنظیم ادارہ تحقیقات اسلامی ۱۹۶۲ء کے دستورِ پاکستان کی رو سے وجود میں آئے اور ۱۹۷۳ء کے دستور میں بھی انہیں برقرار رکھا گیا۔ کونسل کا بنیادی فریضہ یہ تھا کہ وہ سفارشات کرے کہ ملک کے مروجہ قوانین کو کس طرح احکامِ اسلامی کے مطابق بنایا جاسکتا ہے۔ کونسل نے اپنی زندگی کے تیرہ سال گزارنے کے بعد پچھلے سال اپنی سفارشات کی پہلی قسط حکومت کو ارسال کی۔ ان سفارشات میں یہ کہا گیا تھا کہ اتوار کے بجائے جمعہ کو ہفت روزہ تعطیل قرار دی جائے۔ عیسوی کے بجائے ہجری کیلنڈر اختیار کیا جائے۔ شلوار قمیض کو قومی لباس قرار دیا جائے اور سرکاری تقاریب میں یہ قومی لباس لازماً پہنا جائے (وغیرہ وغیرہ)۔ ہم نے ان سفارشات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ مملکتِ پاکستان ہی میں نہیں، اس وقت ساری دنیا میں اسلام، زمانے کے تقاضوں کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ ہم ہزار برس سے دعوے کرتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام تمام نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔ اس وقت اقوامِ عالم ہم سے پوچھتی ہیں کہ وہ کون سا حل ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ اور اگر وہ واقعی کوئی حل پیش کرتا ہے تو (ساری دنیا کو چھوڑیئے) مسلمان مملکتیں اس کی روشنی میں اپنی مشکلات کو حل کیوں نہیں کر لیتیں؟ اقوامِ عالم کی نگاہیں اس ضمن میں مملکتِ پاکستان پر لگ رہی ہیں۔ اہلِ پاکستان اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف تک رہے ہیں۔ اور اس کونسل نے بارہ تیرہ سال کی تحقیقات کے بعد یہ سفارشات پیش کیں۔ ہم نے آخر میں لکھا تھا کہ اس وقت دنیا کا اہم ترین اور مشکل ترین مسئلہ معاشی ہے۔ اس کونسل کو چاہیئے کہ وہ سب سے پہلے یہ بتائے کہ اسلام کس قسم کا معاشی نظام پیش کرتا ہے اور اُس سے کس طرح دنیا کی مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ اس ضمن میں ہم نے ربٰو کے متعلق خصوصیت سے ذکر کیا تھا کیونکہ کونسل کی (قسطِ دوم کی) سفارشات میں ایک شق یہ بھی تھی کہ ربٰو کو ختم کر کے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا جائے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہماری اس درخواست کو درخورِ اعتنا سمجھا گیا یا کونسل کو خود ہی اس مسئلہ کی اہمیت کا احساس ہوا کہ انہوں نے ربوٰ کے متعلق ایک سوالنامہ جاری کیا ہے جس میں عوام اور علماء سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی رائے دیں۔ ہم اس سوالنامہ کو (روزنامہ نوائے وقت لاہور کی اشاعت بابت ۲۱ مارچ ۱۹۷۶ء کے حوالے سے) درج ذیل کرتے ہیں:۔

(۱) قرآن مجید اور سنت کی روشنی میں "ربا" سے کیا مراد ہے؟

ا۔ اور اس سے قبل از اسلام کیا مراد لی جاتی تھی؟

ب۔ کیا ربوٰ کی موجودہ ترقیاتی دور میں نئی تشریح کی جا سکتی ہے؟

(۲) کیا اسلامی تعلیمات اور احکام کے مطابق دو مسلم ملکوں کے درمیان یا ایک مسلم اور دوسری غیر مسلم ریاست کے درمیان سود کا کاروبار جائز ہے؟

(۳) حکومت قومی ضروریات کے لئے جو قرضے جاری کرتی ہے کیا ان پر سود "ربوٰ" کی ذیل میں آتا ہے؟

(۴) کیا آپ کے خیال میں غیر سودی بنکاری نظام ممکن ہے؟

(۵) سود لینے کے معاملے میں کیا پبلک اور پرائیویٹ بنکاری میں امتیاز ممکن ہے؟

(۶) کیا حکومت کے مقبوضہ بنکوں کو نامعلوم یا غیر تشریح شدہ مالکوں کے بنک سمجھا جا سکتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر ایسے بنکوں کی اسلام کی نظر میں کیا حیثیت ہوگی؟

(۷) کیا اسلامی اصولوں کے مطابق سرمائے کو پیداواری ایجنٹ سمجھا جا سکتا ہے اور کیا اسے استعمال کرنے والوں کو معاوضہ دیا جا سکتا ہے؟

ب۔ اگر ایسا ہے تو کیا اسلام حصہ داروں میں منافع کی اجازت دیتا ہے؟

(۸) کیا آپ کے خیال میں موجودہ اقتصادی حالات میں۔

ا۔ یہ ممکن ہے کہ ملکی اور غیر ملکی تجارت کو بنک کی سہولتیں حاصل کئے بغیر چلایا جائے؟

ب۔ اگر جواب نفی میں ہے تو کیا آپ اسلامی قوانین کے مطابق اس کا متبادل حل پیش کر سکتے ہیں؟

(۹) کیا بیمے کا کاروبار سود کے بغیر چلایا جا سکتا ہے؟

(۱۰) اسلامی اقتصادی نظام میں بچت کے لئے کیا ترغیبات دی گئی ہیں؟

(۱۱) ایک ملازم کو اس کے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض ملنے پر جو رقم بطور سود دینی پڑتی ہے

(ا) اور پھر اس کے اسی فنڈ میں جمع کر دی جاتی ہے کیا آپ اسے "ربوٰ" کہیں گے؟

(ب) مندرجہ بالا صورت میں اگر ملازمت دینے والا ادارہ خود بھی پراویڈنٹ فنڈ میں کچھ رقم دیدے تو کیا صورت ہوگی؟

(۱۲) پراویڈنٹ فنڈ اور بنک کی بچت پر جو منافع دیا جاتا ہے کیا وہ "ربوٰ" کی تعریف میں آتا ہے؟

(۱۳) کیا انعامی بانڈوں پر انعامات یا بنکوں میں بچت پر انعامات "ربوٰ" کی تعریف میں آتے ہیں؟

(۱۴) اسلامی قوانین کے تحت تجارتی قرضوں اور غیر تجارتی قرضوں میں امتیاز کس طرح کیا جائے گا، جبکہ

پیداواری قرضوں پر سود لیا جائے اور دوسری قسم کے قرضے بلاسود ہوں۔

(۱۵) اگر سود کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے تو اسلامی نظام کے مطابق بچت اور سرمایہ کے استعمال کے بارے میں کیا ترغیبات دی جائینگی ؟

(۱۶) موجودہ جدید اقتصادی نظریے کے مطابق سود کے معنی مختلف صورتوں میں مختلف ہیں۔ بعض اوقات فرضی سود کے نرخ مشتہر کر دیئے جاتے ہیں جس سے سرمایہ کا تحفظ مطلوب ہوتا ہے۔ کیا اس نظریے کو خواہ سود ادا کیا جائے یا نہ، استعمال کیا جا سکتا ہے ؟

سب سے پہلے تو اس حقیقت پر غور کیجئے کہ اس کونسل اور اس کے ذیلی ادارہ پر اس وقت تک اس غریب قوم کے (جو روٹی تک کے لئے غیروں کی محتاج ہے) کروڑوں روپے صرف ہو چکے ہیں۔ اور اس کا ماحصل یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ اس اہم ترین مسئلہ پر اپنی تحقیقات کا نتیجہ پیش کرے، وہ علماء اور عوام سے کہہ رہی ہے کہ وہ بتائیں کہ اسلام کا اس باب میں کیا حکم ہے ؟ یا للعجب !

اب سوالنامے کی طرف آیئے۔ اس میں پہلی شق یہ ہے کہ "قرآن مجید اور سنت کی روشنی میں ربٰو سے کیا مراد ہے ؟" ہم گزشتہ پچیس سال سے علمائے کرام کی خدمت میں یہ عرض کرتے چلے آ رہے ہیں کہ وہ براہ کرم "سنت" کی کوئی ایسی تعریف (DEFINITION) پیش فرما دیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اور یہ بھی متعین کر دیں کہ وہ سنت کس کتاب میں ملے گی۔ یہ آج تک کسی نے نہیں کیا (حالانکہ اسلامی قانون وضع کرنے کیلئے یہ بنیادی اصول ہے) اس سوال سے پیچھا چھڑانے کے لئے کیا یہ گیا کہ طلوع اسلام کے خلاف پروپیگنڈا عام کر دیا۔ جماعتِ اسلامی (جو اس پروپیگنڈے میں پیش پیش تھی) کے امیر (یا بانی) مودودی صاحب نے تنگ آ کر اس امر کا اعتراف کر لیا کہ کتاب و سنت کی رو سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو۔ اب یہ کونسل انہی علماء سے پوچھتی ہے کہ کتاب و سنت کی روشنی میں ربٰو سے کیا مراد ہے ؟ آپ ان علماء کے جوابات کا انتظار فرمایئے اور پھر دیکھئے کہ ان کے جوابات میں کس قدر اختلاف ہے ۔ جو علماء کرام ہزار برس میں یہ نہیں طے کر سکے کہ سنت کی رو سے نماز کی متفق علیہ شکل کیا ہے، وہ اس قسم کے سوالات کا متفق علیہ جواب کیا دیں گے ؟

سوالات میں جگہ بہ جگہ "اسلامی اصول" "اسلامی قوانین" "اسلامی نظام" وغیرہ الفاظ آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں "اسلام" کے متعلق بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے جو "سنت" کے متعلق اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ یہاں ہر فرقہ کا اسلام الگ ہے۔ ہم نظریاتی کونسل سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ کس فرقے کے اسلام کی رو سے ان سوالات کا جواب طلب فرما رہے ہیں ؟

طلوع اسلام اسلامی مملکت کے سلسلے میں یہ کہتا چلا آ رہا ہے کہ قرآن کریم نے جن احکامات کے صرف اصول دیئے ہیں۔ اسلامی مملکت ان کی جزئیات اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود متعین کرے گی۔ (واضح رہے کہ طلوع اسلام نے ہمیشہ اس کی وضاحت کی ہے کہ اسلامی مملکت سے مراد خلافت علیٰ منہاج نبوت ہے)۔ اس کے ایسا کہنے پر حسب معمول، شور مچا دیا گیا کہ یہ الحاد ہے

بے دینی ہے، کفر ہے اور نہ معلوم کیا کیا ہے۔ اب نظریاتی کونسل یہ پوچھ رہی ہے کہ "کیا ربٰو کی، موجودہ ترقیاتی دور میں، نئی تشریح کی جا سکتی ہے"؟ "کیا نئی تشریح کا عملی مفہوم یہی نہیں کہ ربٰو کی جو شکلیں پہلے متعین کی گئی تھیں۔ اُن پر موجودہ ترقیاتی دور میں نظرِ ثانی کی ضرورت لاحق ہو گئی ہے۔ طلوعِ اسلام یہی بات کہے تو کافر اور مرتد اور علمائے کرام پر مشتمل اسلامی نظریاتی کونسل وہی بات کہے تو عین مطابق اسلام۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ زمانے کے تقاضے ان حضرات کو بھی مجبوراً اس مسلک کی طرف لا رہے ہیں جو طلوعِ اسلام پیش کر رہا ہے۔ لیک بعد از خرابیٔ بسیار۔

اب آیئے اصل موضوع، یعنی ربٰو کی طرف۔ قرآنِ مجید میں ربٰو کے متعلق حکم اصولی طور پر دیا گیا ہے۔ اس نے اس کی مختلف شکلوں کا ذکر یا جزئیات کا تعین خود نہیں کیا۔ اس کی چند ایک شکلیں اسلام کے صدرِ اول میں عام طور پر رائج تھیں۔ ظاہر ہے کہ اُس دور میں نافذ کردہ قوانین میں انہی شکلوں کا ذکر ہو سکتا تھا۔ اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں دنیا کے معاشی نظام میں کئی تغیرات آئے اور اس میں کتنی ہی پیچیدگیاں اور وسعتیں پیدا ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ اُس زمانے کی معدودے چند اور مختصر سی شکلوں سے متعلق احکام آج کی اقتصادیات کو محیط نہیں ہو سکتے۔ ان کے متعلق قرآن کریم کی اصولی ہدایات کی روشنی میں ازسرِ نو سوچنا ہوگا۔ لیکن ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ زندگی سے متعلق کسی مسئلہ پر ازسرِ نو غور و فکر کو الحاد اور بے دینی قرار دے دیا جاتا ہے۔ جب تک اس جمود آفریں ذہنیت کو بدلا نہیں جاتا، ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ آپ ذرا اس سادہ سی حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآنِ کریم نے ربٰو کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ بعد میں جب قرآنی نظام کی جگہ ملوکیت نے لی، اور نظامِ سرمایہ داری عین مطابقِ اسلام قرار پا گیا تو ربٰو کے متعلق فقہی احکام وضع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ احکام ایسے ہی ہو سکتے تھے جو نظامِ سرمایہ داری کے اندر فٹ ہو سکیں۔ اب اگر انہی قوانین کو ابدی اور غیر متبدل تصور کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نظامِ سرمایہ داری کو (جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا) برقرار رکھنا چاہتے ہیں، یہ انہی قوانین کا نتیجہ تھا کہ ربٰو کا ترجمہ سود یا بیاج کر دیا گیا۔ اور اسے انگریزی زبان میں (INTEREST) یا (USURY) سے تعبیر کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم جب بھی ربٰو کا لفظ بولتے ہیں تو ہمارے ذہن میں اس کا مطلب سود بیاج یا (INTEREST) وغیرہ ہی ہوتا ہے۔ حالانکہ ربٰو کی جامع اصطلاح اِن مطالب کی تنگ ناؤں میں نہیں گھر سکتی۔

زمانۂ نزولِ قرآن میں دنیا میں نظامِ سرمایہ داری عام تھا۔ لیکن سرمایہ داری (یا کیپیٹلزم) کی اصطلاحات وضع نہیں ہوئی تھیں) کم از کم عربی زبان میں اس کے لئے کوئی خاص اصطلاح مروج نہیں تھی۔ قرآنِ کریم نے اپنا معاشی نظام پیش کیا جس نے نظامِ سرمایہ داری کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دیا۔ اُس نے نظامِ سرمایہ داری کے لئے ربٰو کی اصطلاح استعمال کی۔ لہٰذا ربٰو سے مراد سود یا بیاج نہیں۔ خود نظامِ سرمایہ داری ہے۔ اس کی وضاحت خود دورِ حاضرہ کے علمِ اقتصادیات نے کر دی ہے۔ اس علم کی رو سے دو بنیادی سوال زیرِ غور لائے جاتے ہیں اور وہ یہ کہ (۱) معاوضہ سرمائے

کا ہے یا (۲) محنت کا؟ قرآن کریم نے کہا کہ معاوضہ محنت کا ہے ۔ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹) سرمائے کا معاوضہ نہیں۔ ربٰو کے معنی ہیں سرمایہ پر زاید رقم۔ چنانچہ جب اس نے ربٰو کو حرام قرار دیا۔ (۲/۲۷۹) تو یہ کہہ کر بات واضح کر دی کہ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ (۲/۲۷۹) تم صرف اپنا سرمایہ واپس لے سکتے ہو، اس پر زاید ایک پائی بھی نہیں لے سکتے۔ یہ حرام ہے۔ اگر آپ انہی چند الفاظ پر غور کریں تو حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ربٰو سے مراد نظامِ سرمایہ داری ہے جس میں سرمائے سے زاید رقم لینا جائز سمجھا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ربٰو اُس اقتصادی نظام کا نام ہے جسے ختم کرنے کے قرآن آیا تھا۔ ربٰو اور قرآن کا معاشی نظام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اور ضد بھی کس قسم کی، اس کا اندازہ ذیل کی وضاحت سے لگ سکتا ہے۔

قرآن کریم نے مختلف جرائم (یعنی قرآنی قوانین کی خلاف ورزی) کے لئے مختلف سزائیں مقرر کی ہیں۔ جرمِ قتل، سنگین ترین جرم ہے۔ اُس کی سزا (بشرطیکہ وہ قتل بالعمد ہو) موت ہے۔ لیکن ربٰو کے متعلق اس نے کہا ہے کہ جو لوگ اس سے باز نہیں آتے انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا اور رسول (یعنی اسلامی نظام) اُن کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہے۔ آپ ذرا سوچیئے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو جو پہلی بار جنگ کی اجازت دی تو یہ کہہ کر کہ "یہ مخالفین جو تمہارے خلاف جنگ کرنے کیلئے چڑھ دوڑے ہیں، تمہیں ان کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے (۲۲/۳۹) یعنی قرآن کریم اِن مخالفین کے خلاف خود اعلانِ جنگ نہیں کرتا۔ اگر وہ جنگ پر اتر آئیں تو ان کے خلاف جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ اس کے برعکس ربٰو ایک ایسا اقدام ہے کہ قرآن کریم اس کے مرتکبین کے خلاف خود اعلانِ جنگ کرتا ہے (۲/۲۷۹) اب آپ سوچیئے کہ قرآن جس جرم کے خلاف خود اعلانِ جنگ کرے وہ کیا اتنا ہی ہوگا کہ ایک شخص کسی کو سو روپیہ قرض دے کر اُس پر پانچ روپیہ سود لے لے! یقیناً یہ جرم تو ایسا سنگین نہیں ہو سکتا کہ ایسا کرنے والوں کے خلاف اسلامی مملکت اعلانِ جنگ کر دے! یہ کوئی انفرادی جرم نہیں۔ یہ ایک ایسا معاشی نظام ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ لہٰذا جو لوگ ایسا نظام قائم کریں گے اُنہیں مملکت کے خلاف باغی قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ قرآن کریم نے بغاوت کے لئے بھی وہی الفاظ استعمال کئے ہیں (يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ (۵/۳۳)، جو الفاظ ربٰو کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ (حَرْبٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۔ (۲/۲۷۹)۔ بلکہ ان دونوں میں بھی ایک بنیادی فرق ہے۔ باغیوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرتے ہیں، اور نظامِ ربٰو کے حامیوں کے متعلق کہا کہ خدا اور رسول ان کے خلاف جنگ کریں گے۔ گویا یہ جرم عام بغاوت سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

ایک نکتہ اور بھی قابلِ غور ہے۔ قرآن کریم اپنے احکام کو اُس دن سے نافذ العمل قرار دیتا ہے جس دن انہیں صادر یا نافذ کیا جائے۔ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہو وہ اُسے

قابلِ مواخذہ قرار نہیں دیتا (ملاحظہ ہوں ۲۳/۹۵ ، ۵/۹۳)۔ ربوٰ کے متعلق اُس کا ردِعمل اس سے مختلف ہے وہ کہتا ہے کہ اگر تم نے کسی شخص سے ربوٰ کا معاملہ کیا تھا اور اس معاہدہ کی رُو سے اس شخص کے ذمے تمہارے سرمایہ سے زاید رقم بنتی ہے جسے تم نے ابھی تک وصول نہیں کیا، تو اس حکم کے نافذ ہونے کے بعد تم اُس زاید رقم کو بھی وصول نہیں کر سکتے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارے خلاف بھی اعلانِ جنگ ہو گا۔ (۲/۲۷۸، ۲۷۵)

ان تصریحات کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ ربوٰ سے مراد پورے کا پورا نظامِ سرمایہ داری ہے نہ کہ سود یا بیاج یا منافع۔ لہٰذا نظامِ سرمایہ داری کو برقرار رکھتے ہوئے یہ سوچنا کہ ربوٰ کے متعلق "اسلامی احکام" کیا ہیں، اسلامی نظام سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) ہے۔ یعنی جب کسی کے پاس اپنی ضروریات سے زاید روپیہ ہو گا تو اس سرمایہ کے استعمال کا سوال پیدا ہو گا۔ قرآن کا معاشی نظام فاضلہ دولت کے امکان ہی کو ختم کر دیتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ وہ دولت جمع کرنے کو جہنم کے عذاب کا موجب قرار دیتا ہے اور دوسری طرف کہتا ہے کہ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)۔ "اے رسول! یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کتنا روپیہ دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیں۔ ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زاید ہے وہ سب"۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنی نظام میں کسی کے پاس نہ فاضلہ دولت رہتی ہے نہ اس کے استعمال کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لیکن آپ دیکھئے کہ نظریاتی کونسل کے نزدیک اسلام کے معاشی نظام کا تصور کیا ہے۔ سوال نمبر ۱۵ میں کہا گیا ہے۔

> اگر سود کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے تو اسلامی نظام کے مطابق بچت اور سرمائے کے استعمال کے بارے میں کیا ترغیبات دی جائیں گی؟

آپ اس سوال پر غور کیجئے۔ اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ اسلامی نظام میں لوگوں کے پاس بچا یا ہوا روپیہ ہو گا اور اس سرمایہ کو استعمال کیا جائے گا۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ لوگوں کو فاضلہ دولت جمع کرنے اور اس سرمائے کو استعمال کرنے کی ترغیبات کیا دی جائیں! اب ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے نزدیک اسلامی نظام کا یہ تصور ہو، ان سے یہ امید رکھنا کہ وہ ملک میں قرآن کا معاشی نظام نافذ کرنے کی تجاویز پیش کریں گے، اپنے آپ کو خوش فہمی میں رکھنے سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے؟

اندریں حالات آپ غور فرمایئے کہ ہماری ان نظریاتی کونسلوں، ان تحقیقاتی اداروں، اسلامی نظام کے دعووں، دین کی خدمات کے اعلانوں کی حقیقت کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ عام طور پر اسلام کو بحیثیت دین (نظام) سمجھا ہی نہیں جاتا۔ اسے ایک مذہب ہی سمجھا جاتا ہے۔ اور جو لوگ (طلوعِ اسلام کی مسلسل پکار کے نتیجہ میں) اسے دین سمجھتے ہیں وہ اس نظام کو نافذ کرنے پر آمادہ نہیں۔ کیونکہ اس سے ان کے مفادات پر زد پڑتی ہے۔ ان کی ساری جدوجہد کا مقصد عوام کی اشک شوئی

اور اپنی دفع الوقتی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اے کاش ہمارے ان ذمہ دار حضرات کے سامنے قرآن کریم کی یہ وعید ہوتی کہ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ (۱۶/۲۵) یہ لوگ قیامت کے دن اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اپنی کمر پر لادے ہوں گے اور ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی جنہیں یہ بربنائے جہالت گمراہی میں مبتلا کرتے رہے۔ کتنا بُرا ہے یہ بوجھ جسے یہ اٹھائے ہونگے!

آخر میں ہم اسلامی نظریاتی کونسل سے صرف اتنا گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ اس سوالنامہ کے جو جوابات انہیں موصول ہوں وہ انہیں شائع فرما دیں تاکہ قوم کو معلوم تو ہو کہ یہاں اسلام بیچارے کی کیا درگت بن رہی ہے۔ واضح رہے کہ ہم نے قرآنی نظامِ معیشت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ مملکت تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے۔ اگر یہ شرط پوری نہیں ہوگی تو آپ کسی نظام کو بھی اسلامی نہیں کہہ سکتے۔

(ب۔ج)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PTI
PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

Unite4 PTI 5/79

باسمہ تعالیٰ

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیر یاب تو!
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو
(اقبالؒ)

دُنیا نظامِ محمدیؐ کیلئے بیتاب ہے

عیدِ میلاد النبیؐ کی مبارک تقریب ـــــ منعقدہ ۱۴ مارچ ۱۹۷۶ء پر

پرویز صاحب کا

دل گداز اور حقیقت کشا خطاب

کتبہ سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دُنیا نظامِ محمدیؐ کیلئے بیتاب ہے

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینی انتہاست

عزیزانِ گرامی قدر ۔ سلام و رحمت!

یہ ہماری کس قدر خوش بختی ہے کہ ہمیں پھر ایک بار اس تقریبِ مبارک و مسعود میں شرکت کا موقعہ ملا ہے جو وجہہ شرفِ انسانیت اور باعثِ ارتقائے انسانیتِ عالم ہے۔ مبداء فیض کی اس کرم گستری پر ہم اس کی بارگاہ میں جتنے سجودِ تشکر و نیاز بھی ادا کریں، کم ہیں۔ اور پھر یہ حقیقت بھی کس قدر وجہ شادابی قلب و نظر ہے کہ یہ تقریب اس موسمِ بہار میں آئی ہے جس میں زندگی تازہ، شاداب و نمو کا پیغام لئے ہر شجر کائنات سے انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوتی ہے ـــ عید میلاد النبیؐ کی تقریب اور بہار کا موسم۔ کیا حسین و جمیل ہے یہ امتزاج!

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اس تقریبِ سعید پر بارگاہِ رسالتمآبؐ میں میرے نذرانۂ عقیدت کا عنوان ہے ـــ دنیا نظامِ محمدیؐ کے لئے بیتاب ہے ـــ اس موضوع تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ ایک رسول کا فریضۂ زندگی کیا ہوتا ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں اسلام دین کی حیثیت سے نہیں، مذہب کی شکل میں مروج ہے۔ اس لئے عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ رسول بھی محض وعظ و نصیحت کے لئے تشریف لاتے تھے۔ اور لوگوں کو اخلاقی اصلاحات کی ترغیب دے کر اپنا فریضہ ادا کر جاتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ رسول افرادِ معاشرہ کی اخلاقی تہذیب کا فریضہ بھی سرانجام دیتے تھے لیکن یہ چیز مقصود بالذات نہیں ہوتی تھی۔ یہ ایک ارفع و اعلیٰ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی تھی۔ اور وہ مقصد ہوتا تھا انسانوں کی تمدنی، تہذیبی، ثقافتی، عمرانی، معاشرتی، معاشی، سیاسی زندگی میں انقلاب برپا کرنا۔ غلط بنیادوں پر استوار ہر نظام کو منہدم کر کے اس کی جگہ وحی کی بنیادوں پر ایک جدید نظام کی عمارت استوار کرنا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے مجموعہ خطبات کے پانچویں خطبہ میں رسول کے اس فریضہ کو بڑی جامعیت سے واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

فریضۂ رسالت

"محمد عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔"

یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ (عبد القدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔ تصوف کے تمام لٹریچر میں اِن جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے جو ایک فقرے کے اندر شعورِ نبوت اور تصوف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس، ایک نبی کی مراجعت تخلیقی مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانے کے طوفان پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے۔ اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے۔ نبی کے دل میں پیدا ہوتی ہے اسی لئے ایک صاحب وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیا ہے۔ اور اس کے پیغام کی رو سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

میں اس وقت ان تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ تصوف کی حقیقت کیا ہے اور جنہیں صوفی کے مقامات کہا جاتا ہے، ان کی ماہیت کیا۔ اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ نے جس فریضۂ رسالت کی وضاحت کی ہے، وہ کس قدر اہم ہے اور اس سے رسول، دیگر مصلحین، مبلغین اور واعظین سے کس قدر ممتاز اور منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اِس عظیم فریضہ کو کس حسن و خوبی سے سر انجام دیا، کما حقہٗ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ جب تک ہم یہ نہ دیکھیں کہ ظہور نبویؐ کے وقت دنیائے انسانیت کی حالت کیا تھی؛ اس کے لئے ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ ایک غیر مسلم محقق کی شہادت پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ (DENNISON) ایک ممتاز مؤرخِ تہذیب ہے۔ اس نے اپنی کتاب (EMOTION AS THE BASIS OF CIVILIZATION) میں اُس زمانے کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

اُس وقت (ظہورِ اسلام کے وقت) ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصر مشید جو چار ہزار سال میں جا کر تعمیر ہوا تھا، منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اور نوع انسانی پھر اسی بربریت کی حالت کی طرف لوٹ جانے والی ہے جہاں ہر قبیلہ دوسرے

قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا اور آئینی و ضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ قدیم قبائلی آئین اپنی قوت و احترام کھو چکے تھے۔ اس لئے اب ملوکیت کے انداز کہن کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن آئین و شعائر کو رائج کیا تھا وہ نظم و ضبط اور وحدت و یکجہتی کے بجائے تشتت و افتراق اور ہلاکت و بربادی کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وہ وقت آ چکا تھا جب ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی سرسبز اور شاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پہ سایہ فگن تھیں اور آرٹ، سائنس اور لٹریچر کے ندیاں ثمرات سے بہرہ یاب ہو چکی تھیں، اب ڈگمگا رہا تھا۔ عقیدت و احترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھی۔ اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ سلسلۂ حرب و ضرب کے طوفان نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے اور یہ ٹکڑے صرف رسومات پارینہ کے بندھن سے ایک جگہ قائم تھے لیکن ان کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ نہ معلوم کب گر پڑیں۔

اور اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ۔

کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر کہیں سے پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوع انسان کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پہ جمع کر دیتا اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لیتا؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہیئے تھا۔ اس لیئے کہ پرانی رسومات اور آئین و ضوابط سب مردہ ہو چکے تھے اور انہی جیسے اور آئین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔

یہ امر موجب حیرت و استعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر سرزمین عرب سے پیدا ہوا۔ اور اس وقت پیدا ہوا جبکہ اس کی اشد ضرورت تھی۔

علامہ اقبال نے عالم انسانیت کی اس حالت کو اپنے مخصوص انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

بود انساں در جہاں انساں پرست ناکس و نابود و مند و زیر دست
سطوت کسریٰ و قیصر رہزنش بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر بہر یک نخچیر، صد نخچیر گیر

محدث دہلوی شاہ ولی اللہ نے اسی ضمن میں کہا ہے کہ۔

چونکہ ہمارے نبی اکرم کے زمانے میں اقوام کے اندر معاشی و معاشرتی فسادات پیدا ہو چکے تھے اور ان کی اقتصادی زندگی سخت خراب ہو چکی تھی اس لئے حضور کو ان خرابیوں کے استیصال کے لئے مبعوث فرمایا گیا۔ اور آپ کے ہاتھوں روم اور ایرانی ملوکیتوں کو برباد کرایا (جو ان ناہمواریوں کا سرچشمہ تھیں)

(تفہیمات الٰہیہ جلد اول ص [illegible])

یوں تو خدا کا ہر رسول اسی قسم کے انقلاب کا داعی ہوتا تھا لیکن حضرات انبیائے سابقہ اور حضورؐ

عالمگیر رسالت

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ازمنۂ گذشتہ میں چونکہ آبادیاں محدود ہوتی تھیں اور وسائل مواصلات اور ذرائع رسل و رسائل عام نہیں تھے اس لئے ایک رسول کا دائرہ اثر و نفوذ ایک خاص خطۂ زمین تک محدود ہوتا تھا۔ لیکن حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایسے زمانہ میں ہوئی جو عصرِ قدیم اور دورِ حاضرہ کے درمیان حدِ فاصل تھا۔ اب دنیا کی آبادیوں نے محدود نہیں رہنا تھا۔ انہیں پھیل کر ایک عالمگیر معاشرہ بن جانا تھا۔ اس لئے حضورؐ کی بعثت نہ کسی خاص قوم کے لئے مخصوص تھی نہ کسی خاص خطۂ زمین تک محدود۔ حضورؐ تمام نوعِ انسان کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ قُلْ يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (۷/۱۵۸) "اے رسولؐ! تم تمام نوعِ انسان کو مخاطب کر کے کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف رسولؐ بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔ دوسری جگہ ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا۔ (۳۴/۲۸) "اے رسولؐ! ہم نے تمہیں پوری کی پوری انسانیت کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے"۔ اس "پوری کی پوری" انسانیت سے مراد صرف حضورؐ کے زمانہ کا عالمِ انسانیت نہیں تھا بلکہ اس میں قیامت آنے والے انسان سب شامل تھے۔ سورۃ الجمعہ میں ہے کہ ہم نے ان لوگوں کی طرف اپنا رسول بھیجا جن کی طرف پہلے کوئی رسول نہیں آیا تھا (یعنی اہلِ عرب)۔ لیکن یہ صرف انہی کی طرف رسول نہیں تھا۔ یہ اُن کی طرف بھی رسولؐ تھا وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (۶۲/۳)۔ "جو ان کے بعد آنے والے تھے"۔ ظاہر ہے کہ ان کے بعد آنے والوں میں تمام دنیا کے قیامت تک کے انسان شامل تھے۔

یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں خدا کے متعلق کہا کہ وہ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۱/۱) ہے۔ اس کی کتاب کے متعلق کہا کہ وہ ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۳۸/۸۷) ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا کہ آپؐ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱/۱۰۷) ہیں۔ اور اس کی شہادت یہ کہہ کر دی کہ جو کتاب اس رسولؐ کی طرف بھیجی گئی ہے وہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶)۔ "ہر طرح سے مکمل ہے۔ آخری کتاب ہے۔ غیر متبدل ہے۔ اور اس میں کوئی بھی تبدیلی نہیں کر سکتا"۔ یہ اس کتاب کی خصوصیت تھی۔ اور جو انقلاب اس کتاب کی رُو سے برپا ہونا تھا اس کی عالمگیریت کی طرف یہ کہہ اشارہ کر دیا کہ هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ (۹/۳۳)۔ "اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ضابطۂ ہدایت اور مبنی برحقیقت نظام دے کر بھیجا تاکہ وہ نظام دیگر تمام نظامہائے عالم پر غالب آجائے۔ خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گذرے جو متفرق نظاموں کے تحت رہنا چاہتے ہیں۔ خدائے واحد کے نظامِ واحد کو پسند نہیں کرتے"۔

انقلابِ محمدیؐ

اس انقلاب کی وسعت حدود نا آشنا تھی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کا آغاز بہرحال اُس خطۂ زمین سے ہونا تھا جس میں حضورؐ کی بعثت ہوئی تھی۔

اس انقلاب سے وہاں کس قسم کی تبدیلی رونما ہوئی اس کے متعلق بھی ہم غیر مسلم منکرین کی شہادات پیش کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ (PRINGLE KENNEDY) ہمارے دور کا ایک مشہور فلاسفر ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

> چند ہی سال کے عرصہ میں یہ نقشہ کس طرح بدل گیا کس طرح ۶۳۰ء تک یہ دنیا اس دنیا سے یکسر مختلف ہو گئی جو اس سے پہلے تھی۔ نوعِ انسانی کی تاریخ میں یہ باب ایک نمایاں خصوصیت کا حامل ہے۔

(ARABIAN SOCIETY AT THE TIME OF MUHAMMAD. P.18)

کارلائل اپنے مخصوص انداز میں لکھتا ہے:۔

> عربوں کے لئے یہ انقلاب ایک نئی زندگی تھی جو انہیں تاریکی سے نور کی طرف لے آئی تھی۔ عرب اس کے ذریعہ پہلی دفعہ زندہ ہوا۔ ایک ایسی قوم جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کے عالم میں ریوڑ چراتی پھرتی تھی، ان کی طرف ایک رسول آیا جو اپنے ساتھ ایک ایسا پیغام لایا جس پر وہ قوم ایمان لے آئی۔ وہ دیکھو! وہی گمنام چرواہے دنیا کی ممتاز ترین قوم بن گئے۔ وہ حقیر قوم ایک عظیم الشان ملت میں متبدل ہو گئی۔ ایک صدی کے اندر اندر عرب ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی تک چھا گئے۔ اس کے بعد سینکڑوں برس ہو چکے ہیں کہ یہی شان و شوکت اور درخشندگی و تابندگی ہے کہ زمین کے ایک حصہ پر مسلط ہیں۔ یہ سب ایمان کی حرارت سے ہوا۔ ایمان بہت بڑی چیز ہے۔ ایمان ہی سے زندگی ملتی ہے۔ جونہی کسی قوم میں ایمان پیدا ہوا، اس قوم کی تاریخ، اعمال میں نتائج اور روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی بن گئی۔
>
> وہ عرب — یہ محمدؐ — اور ایک سو سال کا عرصہ!
>
> کیا یہ انقلاب ایسا ہی نہیں جیسے ریت کے کسی سیاہ گمنام ٹیلے پر آسمان سے بجلی کی لہر آ گرے اور وہ ریت کا تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتشگیر مادے میں تبدیل ہو کر اس طرح بھک سے اڑ جائے کہ دہلی سے غرناطہ تک اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آ جائے۔
>
> نوعِ انسانی خشک نیستاں کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اس بطلِ جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا اور تمام نوعِ انسانی کو شعلہ صفت بنا گیا۔

(HEROES AND HERO WORSHIP. P. 66)

ممتاز تاریخ دان گبن اس باب میں کہتا ہے:۔

محمدؐ کا مذہب شک و ابہام سے بالکل بری ہے اور قرآن، خدا کی توحید کی درخشندہ شہادت۔ نبی عربیؐ نے بتوں، انسانوں اور اجرام سماوی کی پرستش کو اِس بصیرت افروز دلیل کی بنا پر رد کر دیا کہ جو طلوع ہوتا ہے وہ غروب بھی ہوتا ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے وہ مرتا بھی ہے جس کی بنیاد میں فساد ہے اس کا مآل ہلاکت اور تباہی ہے۔ آپ کے دینی جوش اور ولولے نے جو یکسر مبنی علی البصیرت تھا، خالق کائنات کی صورت میں، اس لا انتہا ذاتِ سرمدی کا اقرار کر کے اسے مرکزِ حمد و ستائش قرار دے دیا، جو صورت اور مکان کی جہت سے بلند اور اولاد اور مثیل کی نسبتوں سے بالا تھی۔ وہ ذات جو ہمارے پوشیدہ خیالات تک میں موجود اور خود اپنی ذات سے قائم ہے، اور جس کے سرچشمہ سے عقل و اخلاق کے جوہروں کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ مسلک توحید اس قدر بلند ہے کہ ہماری موجودہ استعداد کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

جو چیز ہمارے لئے سب سے زیادہ وجہِ حیرت ہے وہ اسلام کی اس قدر جلد اشاعت نہیں، بلکہ یہ کہ اس کی تعلیم کس قدر ابدی حقائق پر مبنی ہے۔ وہی سادہ لیکن مکمل نقش جو محمدؐ عربی نے مکہ اور مدینہ میں انسانی قلوب پر کندہ کیا تھا۔ اور جو اِن بارہ صدیوں کے انقلاب کے باوجود ہندوستان سے افریقہ تک قرآن کے متبعین کے ہاں محفوظ چلا آتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے مذہب اور عقیدہ کے مقصود کو عام انسانی حواس و تخیل کی سطح پر آنے نہیں دیا۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، اسلام کا نہایت سادہ اور غیر متبدل عقیدہ ہے۔ ان کا خدائی تصور کبھی کبھی مرئی ہستیوں کا شرمندہ نہیں ہو سکا۔ رسول اللہ کا درجہ کبھی بشریت کی حد سے تجاوز نہیں کر سکا۔ اس کی زندہ تعلیمات نے اس کے متبعین کے جذباتِ عقیدت کو دین و دانش کے حدود سے باہر نہیں جانے دیا۔ یہ ہے اسلام کی سادہ اور ابدی تعلیم۔

(GIBBON — DECLINE & FALL OF ROMAN EMPIRE P.P. 287 & 352)

اور بریفا کہتا ہے کہ:۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ پندرھویں صدی میں نہیں ہوئی، بلکہ اُس وقت ہوئی جب یورپ عربوں کے کلچر سے متاثر ہوا۔ یورپ کی خلقتِ جدیدہ کا گہوارہ اٹلی نہیں بلکہ اندلس ہے۔ اُدھر روما کی تہذیب، گرتے گرتے، بربریت کی حد تک

پہنچ چکی تھی، اور اِدھر دنیائے اسلام (بغداد، قرطبہ، قاہرہ) تہذیب و ذہنی تحریکات کے مرکز بن رہے تھے۔ ان ہی شہروں میں وہ نئی زندگی نمودار ہوئی تھی جس نے انسانی ارتقاء میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا تھا۔ جس وقت یہ نئی تہذیب محسوس طور پر سامنے آئی، دنیا حیاتِ نو سے آشنا ہوئی...... اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تہذیب کا وجود عمل میں نہ آتا۔ ان کے بغیر یہ یقیناً اس خصوصیت کو حاصل نہ کر سکتا تھا جس نے اسے ارتقائی مراحل میں بلند ترین سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ مغربی کلچر میں کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں عربی ثقافت کا رنگ جھلکتا ہو۔ لیکن ایک شعبہ تو ایسا ہے جس میں یہ اثر بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور یہی وہ شعبہ ہے جو درحقیقت عصرِ حاضر کی حقیقی قوت کا باعث اور اس کی فتوحات کا ذریعہ ہے۔ یعنی علم الاشیاء ــــ سائنس کی روح! ہماری سائنس صرف اسی حد تک عربوں کی رہینِ منت نہیں کہ انہوں نے ہمیں عجیب و غریب نظریات و انکشافات سے روشناس کرایا! نہیں! بلکہ ہماری سائنس کا وجود ہی ان کا شرمندۂ احسان ہے۔ اسلام سے پہلے کی دنیا، درحقیقت زمانہ قبل از سائنس (PRE - SCIENTIFIC AGE) ہے۔ پندرھویں صدی تک یورپ اپنی علوم و فنون کو اپنا تا رہا جو اسے مسلمانوں نے دیئے تھے۔ اس پر کوئی اضافہ نہ کر سکا...... جب اندلس میں تہذیب و ثقافت نے پھر تاریکیوں کی چادر اوڑھ لی تو یورپ میں وہ "جن" نمودار ہوا جسے اندلس کی سرزمین نے پیدا کیا تھا۔ یورپ کو زندگی (صرف) سائنس نے دی۔ اسلام کے گوناگوں اثرات اس کی حرارت کا موجب بنے۔

(BRIFFAULT — MAKING OF HUMANITY)

ہم چاہتے تو اس باب میں اسی قسم کی بیسیوں اور شہادات بھی پیش کی جاسکتی تھیں لیکن ہم سرِدست انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد ہمیں خود اپنے زمانہ کی طرف آنا ہے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ دنیا اُس نظام کے احیاء کے لئے کس قدر تڑپ رہی ہے جو سرزمینِ عرب میں قائم ہوا تھا۔

اس کے بعد؟

حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اس عظیم انقلاب کی بنیاد رکھی گئی اور حضور کے سچے جانشینوں نے اس عمارت کو استوار کیا۔ اُن کے بعد آنے والوں نے اپنی مساعی کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا جس سے دین مذہب میں بدل گیا اور اس انقلاب کی وہ شکل بھی باقی نہ رہی۔ میں اس حقیقت کو بار بار وضاحت سے بیان کر چکا ہوں کہ نظامِ خداوندی جن قوانین کی بنیادوں پہ استوار ہوتا ہے وہ ازلی اور ابدی ہیں اور فطرت کے قوانین کی طرح ہر وقت کارفرما رہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ جس وقت کوئی ایسی جماعت پیدا ہوتی ہے جو اُس نظام کو عملاً متشکل کرنے کا

تہیہ کرتی ہے، وہ قوانین چند دنوں میں محسوس نظام کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر ایسی جماعت باقی نہیں رہتی تو پھر وہ اپنی رفتار سے غیر محسوس طور آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں ـــ لیکن یہ رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق "خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے" ـــ ان قوانین کے اپنی رفتار سے کارفرما رہنے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی فکر اور عقل کی رو سے اپنے لئے ایک نظامِ زندگی متعین اور متشکل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کے نتائج بتاتے ہیں کہ وہ نظام وجہِ اطمینان نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ اسے چھوڑتا ہے اور کوئی دوسرا نظام وضع کرتا ہے۔ انہی تجرباتی طریقوں سے وہ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب وہ کسی نظام کو کسی حد تک بھی اپنے لئے قابلِ اطمینان پاتا ہے تو اس نظام کا رخ اسی منزل کی طرف ہوتا ہے جسے قرآن کریم نے عالمگیر انسانیت کے لئے تجویز کیا ہے۔ اس وقت دنیا میں ایک ہمہ گیر شورش برپا ہے۔ انسانوں نے اپنے تجرباتی طریق کی رو سے صدیوں کی منازل طے کرنے کے بعد اس وقت جو نظام وضع کئے ہیں وہ انہیں قابلِ اطمینان نہیں پا رہا اور کسی ایسے نظام کے لئے تڑپ رہا ہے جو اس کے لئے وجہِ سکون اور باعثِ فلاح و فوز بن سکے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ اس وقت دنیا میں جو اہم بنیادی نظام مروج ہیں، کیا انہیں اقوامِ عالم نے اطمینان بخش پایا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں تو ان کے ذہن میں اس نظام کا تصور کس قسم کا ہے جو ان کے نزدیک وجہِ طمانیت بن سکتا ہے۔

(۲)

نظامِ حکومت

جو نظام قرآن کریم کی رو سے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں متشکل ہوا تھا اس کی بنیاد اس اہم حقیقت پر تھی کہ دنیا میں کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کر سکے۔ ـــ خواہ وہ حکومت لاقانونیت کی رو سے ہو یا انسانوں کے خود وضع کردہ قوانین کے مطابق۔ وہ اِن دونوں شکلوں کو غلامی سے تعبیر کرتا ہے۔ اس غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے اس نے اعلان کیا کہ:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُونُوا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں خواہ اسے ضابطۂ قوانین یا نظامِ اقتدار حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں، میرے محکوم، مطیع اور فرمانبردار بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تمہیں اس کتاب خداوندی کے مطابق، جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو، اور اس پر غور و فکر کرتے رہتے ہو، خدا کے محکوم بن جانا چاہیئے۔

اس آیہ جلیلہ میں نظری طور پر ہی نہیں کہا گیا کہ تم خدا کے محکوم بن جاؤ، اس کا عملی طریقہ بھی بتا دیا اور وہ یہ کہ خدا کے محکوم بننے سے مراد یہ ہے کہ تم اس کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرو۔ (دیکھئے ۳۰/۵۸)۔ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرنے سے مراد یہ ہے کہ انسانوں کو ـــ خواہ وہ ایک فرد ہو یا افراد کی جماعت ـــ قانون سازی کا حق حاصل نہیں۔ حکومت کا فریضہ قوانین خداوندی کو نافذ کرنا ہے نہ کہ خود قوانین وضع کرنا۔ یہ تھا وہ عملی طریق جس سے قرآن کریم نے نوعِ انسان کو صحیح آزادی کا منشور دیا۔ صدرِ اول کے بعد یہ نظام نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور انسانوں نے عقل کے تجرباتی طریق کی رُو سے اپنے لئے نظامِ حکومت خود وضع کرنا شروع کر دیا۔ صدیوں کے تجربات کے بعد اب وہ اس نظام تک پہنچے ہیں جسے سیکولر نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کا عملی ذریعہ مغرب کا نظامِ جمہوریت ہے۔

جمہوری نظام

سوال یہ ہے کہ کیا یہ نظام اطمینان بخش ثابت ہوا ہے۔ اس کے لئے خود مغربی مفکرین کی آراء ملاحظہ فرمائیے۔ (مثلاً فرانسیسی مفکر (RENE - GUINN) لکھتا ہے۔

> اگر لفظِ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے اور جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی ..... ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں، ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ وہ خود اپنے آپ حاکم ہیں۔ عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ اس اصول کی رُو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر بھی لگایا جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا۔
>
> (CRISIS OF THE MODERN WORLD)

جمہوری نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ اکثریت کے فیصلے حق پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس باب میں پروفیسر ایلفرڈ کوبن لکھتا ہے کہ۔

> یہ اصول بنیادی طور پر غلط ہے۔ اگر کسی غلط بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو، نہ وہ کہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں[1]

پروفیسر کوہن نے کہا ہے کہ فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔ سوال یہ ہے کہ اس کا معیار کیا ہے کہ فلاں فیصلہ درحقیقت صحیح ہے؟ اس کے لئے خود مغربی مفکرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسانوں کو قانون سازی کا حق حاصل ہی نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ان کے فیصلے ہر حالت میں صحیح نہیں ہو سکتے۔ فرانسیسی مفکر (BERTRAND DE JOUVENEL) نے ایک مشہور کتاب لکھی ہے (SOVEREIGNTY)۔ وہ اس میں کہتا ہے کہ:-

> بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر آپ ایک دفعہ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ انسانی مرضی اور ارادے کو اقتدارِ مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظام حکومت بھی قائم ہوں گے حقیقت کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظام ملوکیت اور جمہوری نظام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی رو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو، یہ اصول اُسے یکساں حقِ مطلق العنانی عطا کر دیتا ہے۔ (ص 199)

اسی حقیقت کو امریکی ماہر آئین ایڈورڈ کارون اپنی کتاب (THE HIGHER LAW) میں بڑی وضاحت سے سامنے لاتا ہے۔ وہ اس میں مشہور مقنن (CICERO) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے:-

> حقیقی قانون، مبنی بر حکومت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا، غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے۔ یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے، اور منکر سے روکتا ہے۔ یہ مملکت کا مقدس فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو۔ اسے اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے۔ نہ ہی وہ اسے منسوخ کر سکتی ہے نہ ہی ہماری پارلیمان اور نہ ہی سینیٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی قید سے آزاد کر دے۔۔۔۔۔ نہ ہی اس قانون کی کیفیت یہ ہے کہ روما کے لئے الگ قانون ہو اور ایتھنز کے لئے الگ۔ ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل۔ یہ ایک ازلی، غیر متبدل قانون ہے جو ابدی طور پر تمام اقوام کو اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے (ص 1)

یہ اقدار و قوانین کہاں سے ملیں گے اس کے متعلق ہمارے دور کا سب سے بڑا سائنس دان آئن سٹائن کہتا ہے کہ:-

> یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جا سکتیں۔ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیاد عقلِ انسانی پر نہیں ہوتی لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اترتی ہیں۔ اس لئے کہ صداقت کہتے ہی انہیں ہیں

جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔

—— (٠) ——

نظامِ عدل

حکومت کا بنیادی منصب نظامِ عدل کا قیام ہے۔ قانون کی دنیا میں عدل سے مراد ہوتا ہے مروجہ قوانین کے مطابق فیصلے کرنا۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ قوانین ہی حق پر مبنی نہ ہوں تو ان کے مطابق فیصلوں کو عدل کیسے کہا جائے گا؟ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ خود اقوامِ مغرب کے مفکرین کے نزدیک انسانوں کو قوانین وضع کرنے کا حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ بنا بریں انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے مطابق فیصلے عدل کہلا ہی نہیں سکتے۔ صرف قوانینِ خداوندی کے مطابق فیصلے عدل کہلا سکتے ہیں۔ (EMIL — BRUNNER) ہمارے دور کا بہت بڑا فلسفۂ قانون کا ماہر ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:۔

> جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج کے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے۔ ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی مینا کاری اور ملمع سازی ہوگی۔

(JUS[illegible]E AND THE SOCIAL ORDER)

آپ نے غور فرمایا کہ عصرِ حاضر کا انسان اپنے وضع کردہ نظامِ حکومت کے ہاتھوں [illegible] قدر تنگ آ چکا ہے اس کے نزدیک وہی نظامِ حکومت موجبِ اطمینان اور مبنی بر صداقت کہلا سکتا ہے جو قوانین خداوندی کے نافذ کرنے کا ذریعہ ہو۔ وہ ان قوانین کی تلاش میں بری طرح سرگرداں پھر رہا ہے۔

—— (٠) ——

نیشنلزم

قرآنِ کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے یہ اعلان کیا کہ کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً۔ (۲/۲۱۳) "تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری ہے"۔ اس لئے اسے مختلف قبیلوں، نسلوں اور قوموں میں تقسیم کر دینا جہنم کی تباہی لانے کے مرادف ہے۔ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کے مطابق ایک ایسی امت

تشکیل فرمائی جو رنگ، نسل، زبان، وطن کی انسانوں کی خود ساختہ حدود و امتیازات کو مٹا کر نظریہ کی وحدت کی بنیادوں پر قائم ہوئی۔ یہ انسانی ہیئت اجتماعیہ کی مبنی بر حقیقت شکل تھی اور اس کا نتیجہ وہ جنت جو یک رنگ و ہم آہنگ انسانوں کے اجتماع سے وجود میں آتی ہے۔ لوگوں نے اس تصور کو فراموش کر کے نیشنلزم کا نظریہ وضع کیا۔ اسے عمل میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اس کے تباہ کن نتائج کے ہاتھوں مغربی مفکرین چیخ اٹھے ہیں۔ (مثلاً) پروفیسر میتین اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں لکھتا ہے:-

> جنگ کی بنیاد نیشنلزم ہے۔ جس طرح افراد میں باہمی تنازعہ کی بنیاد جذبہ انانیت ہوتا ہے۔ ارتقائے جنگ کی ساری تاریخ کا سراغ اس بنیاد سے لگ سکتا ہے۔

برٹرینڈ رسل کہتا ہے کہ:-

> ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوع انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ (دلچسپ تماشہ یہ کہ) ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے۔ لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔
>
> (THE HOPES FOR A CHANGING WORLD.)

وہ اس کے بجائے کس قسم کا نظام چاہتے ہیں اس کے متعلق بھی انہوں نے اب بڑی وضاحت سے کہنا اور لکھنا شروع کر دیا ہے: مثلاً کیتھولک چرچ کا راندۂ درگاہ پادری (TEILARD - DE - CHARDIN) جس کی کتابوں کو کلیسا نے اس کی زندگی میں شائع نہیں ہونے دیا تھا، اپنی کتاب (BUILDING OF THE EARTH) میں لکھتا ہے:-

> اب اقوام کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصبات کو ختم کر دیں اور (مختلف ملکوں اور خطوں کی حدود سے آگے بڑھ کر) خود کرۂ ارض کی تعمیر نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دعوتِ انسانیت کا راستہ۔ اب شعور انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان وطن اور نسل کی تنگنائیوں سے آگے بڑھ کر پوری نوع انسانی کو اپنی آغوش میں لے لے۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر (HUGH MILLER) اپنی کتاب میں جس کا نام ہی اس نے (THE COMMUNITY OF MAN) رکھا ہے، لکھتا ہے:-

تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اس انسانی برادری کا احیاء کرے جو انسانی زندگی کی ابتداء میں موجود تھی، لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندانوں، قبیلوں، اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اسے جا سکتا ہے جو انسانوں کو باہم گرجوڑ دے۔ انسانی ارتقاء کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہونا چاہیئے جو تمام نوع انسان پر مشتمل ہو۔

(GUNNER MYRDAL) سویڈن کا مشہور ماہر اقتصادیات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:-

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے جس میں نہ کرۂ ارض پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ دنیا وہ ہوگی جہاں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے حصولِ مسرت کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔

اس کے بعد یہ مفکر لکھتا ہے کہ:-

ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی ایسی ہی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یک جہتی ہو۔

(BEYOND THE WELFARE STATE)

مشہور امریکی مفکر (LEWIS MUMFORD) لکھتا ہے کہ "تہذیب درحقیقت اس عمل پیہم اور غیر مختتم کا نام ہے جو ایک دنیا اور اس میں بسنے والی ایک انسانی برادری کی تشکیل کرے۔" وہ آگے چل کر لکھتا ہے۔

اگر ہم نے اس عملی وحدت کو مزید التوا میں رکھا تو اس کا نتیجہ عالمگیر تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ مغربی اندازِ معاشرت کا کھیل کھیلا جا چکا ہے اور یہ تمدن بری طرح ناکام ثابت ہوا ہے .... اب دنیا کو ایک ایسے بطلِ جلیل کی ضرورت ہے جو اس کلچر اور تاریخ کی تمام حدود کو توڑ دے جنہوں نے انسان کو اپنے اندر قید کر رکھا ہے اور اس طرح اس کی نشو و نما کے راستے میں بری طرح حائل ہو رہی ہیں ـــــ اس بطلِ جلیل کی ضرورت جو کاروانِ انسانیت کو موجودہ تباہی کے ویرانوں سے نکال کر وحدتِ انسانیت کے عالمگیر نظام کی طرف لے جائے۔

(TRANSFORMATION OF MAN)

اگر ان مفکرین کے سامنے اسلام کی صحیح تاریخ ہوتی تو انہیں نظر آجاتا کہ وہ بطلِ جلیل جو کاروانِ انسانیت کو موجودہ تباہی کے ویرانوں سے نکال کر وحدتِ انسانیت کے عالمگیر نظام کی طرف لے جا سکتا ہے، چودہ سو سال ہوئے نبی آخر الزماںؐ کی شکل میں دنیا میں آیا تھا اور اس نے اس وحدت کو عملاً قائم کر کے دکھا دیا تھا۔ وہ بطلِ جلیل آج اپنے انسانی پیکر میں دنیا میں موجود نہیں لیکن وہ ضابطۂ حیات، جس کے مطابق اس نے اس وحدت کو قائم کیا تھا لفظاً لفظاً دنیا میں موجود ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اگر تم عالمگیر انسانیت کی وحدت چاہتے ہو تو میری طرف آؤ۔

———(٭)———

معاشی نظام

ہمارے دور کو دورِ اقتصادیات (AGE OF ECONOMICS) کہا جاتا ہے۔ اس دور میں انسان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے کمیونزم یا سوشلزم جیسا اقتصادی نظام وضع کیا ہے۔ اس نظام کے اسقام و نقائص کے متعلق میں اتنا کچھ لکھ چکا ہوں کہ اس وقت اس کے دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں میرے ایک خطاب کا عنوان تھا — جہاں مارکس ناکام رہ گیا اس سے آگے — اس میں میں نے بڑی وضاحت سے بتایا ہے کہ خود مارکس نے اپنے تصور کے نظام کو عملاً متشکل کرنے کے لئے کس طرح اپنے عجز کا اظہار کیا۔ اور اس کے بعد میں نے یہ لکھا ہے کہ اس تصور کا نظام، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے کس طرح متشکل کر کے دکھا دیا تھا۔ اور وہ آج بھی قرآن کی روشنی میں کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے۔ میں اس وقت صرف ایک نکتہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ اور وہ یہ کہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے نظامِ سرمایہ داری کے علمبرداروں کو واشگاف الفاظ میں یہ وارننگ دی تھی کہ اگر تم نے اس نظام کو نہ بدلا تو ایک وقت آئے گا جب یہ پسماندہ، مفلس، نادار، محنت کش تنگ آکر تمہارے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنے ساتھ تمہیں بھی لے ڈوبیں گے۔ اسے حضورؐ نے ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا تھا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ :-

> کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصہ میں رہے۔ جو نچلے حصہ میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے تو اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا، ہم نیچے کشتی میں سوراخ کر کے پانی لے لیں گے۔ اب اگر نیچے والوں کو پانی دے کر اس سے نہ روکا گیا تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر انہیں پانی دے کر اس سے روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی)

حضورؐ نے سرمایہ داروں کو یہ وارننگ چودہ سو سال پیشتر دی تھی۔ آپ دیکھئے کہ آج یہ کس طرح حرفاً حرفاً صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ امریکہ سے شائع ہونے والے شہرہ آفاق مجلہ (TIME) نے اپنی ۲۲ دسمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع کیا جس کا عنوان تھا ــــ کرۂ ارض کا ایک نیا تصادم ــــ اس میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت دنیا کی حالت یہ ہے کہ اس کے قریب ۷۵ کروڑ باشندے ساری دنیا کے ذخائر کو غصب اور ہضم کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ اور اس زمین کی قریب ایک سو مملکتوں میں بسنے والے دو ارب باشندے ہر وقت موت کے سائے تلے سسکیاں لے رہے ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یہ تو اس وقت کی حالت ہے۔ لیکن ہم جب اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ دنیا میں ہر روز قریب بیس لاکھ انسانوں کا اضافہ ہو رہا ہے تو سوچئے کہ چند سالوں کے بعد یہاں کس قسم کی قیامت برپا ہو جائے گی۔ اس قیامتِ صغریٰ کی کیفیات کو اس نے صرف چار الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے جب کہا ہے کہ "یہ مسئلہ نسلِ انسانی کے لئے ٹائم بم کی حیثیت رکھتا ہے"۔ دیر صرف اس مہلت کے وقفہ کی ہے۔ جب یہ اپنے وقت پر پھٹا تو یہ پوری نسلِ انسانی کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ اسی آنے والی تباہی کے پیشِ نظر پچھلے دنوں ستر کے قریب ترقی پذیر (UNDEVELOPED) ممالک کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ فلپائن کا پریذیڈنٹ اس کا چیئرمین تھا۔ اس نے اپنے خطبۂ صدارت میں ترقی یافتہ (DEVELOPED) مملکتوں کو وارننگ دی کہ اگر تم ان پسماندہ ممالک کو جلد از جلد اپنے ہمدوش نہ لے آئے تو یہ خود تو تباہ ہوں گے ہی، لیکن اپنے ساتھ تم سب کو بھی تباہ کر کے رکھ دیں گے۔ آپ غور کیجئے عزیزانِ من! کہ وہ تباہی جس کے متعلق نوعِ انسان کے محسنِ اعظمؐ نے چودہ سو سال پہلے وارننگ دی تھی کس قدر حقیقت بن کر سامنے آ رہی ہے۔ اس تباہی سے بچنے کے لئے انسانی فکر نے سوشلزم کا نظام وضع کیا تھا۔ اس نظام کی کیفیت یہ ہے کہ ــــ اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے ــــ وہ ابھی چار قدم بھی نہ چلنے پایا تھا کہ لڑکھڑانے لگ گیا۔ روس میں تو وہ ناکام ہو چکا ہے۔ اسی ہفتہ خبر آئی ہے کہ وہاں کا نظامِ زراعت اس بری طرح ناکام ہو رہا ہے کہ وہاں کی مرکزی کمیٹی نے جھنجھلا کر وزیر زراعت کو الگ کر دیا ہے اور ایسا دوسری مرتبہ کرنا پڑا ہے۔ چین کے متعلق میں نے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا کہ اس کی ترقی کا راز ماؤزے تنگ کی شخصیت ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھئے گا کہ اس کا بھی کس طرح شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ وہاں یہ انتشار چو این لائی کی وفات کے ساتھ ہی شروع ہو گیا ہے حالانکہ ماؤزے تنگ ابھی زندہ ہے۔ عزیزانِ من! جو نظام بھی شخصیات کے سہارے قائم ہوتا ہے اس میں اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے کی سکت نہیں ہوتی۔ نظام وہی قائم رہ سکتا ہے جو غیر متبدل اقدار کی محکم بنیادوں پر استوار ہو۔

مذاہبِ عالم

دنیا کے مختلف مذاہب کے علمبردار پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس وقت دنیا جس جہنم میں گرفتار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسلیں مذہب سے بیگانہ ہو رہی ہیں۔ مذہب کے ان علمبرداروں میں خود ہم مسلمان بھی شامل ہیں کیونکہ ہمارے ہاں بھی وہ دین موجود نہیں جسے خدا نے مقرر کیا - اور حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے قائم کر کے دکھایا تھا۔ ہمارے ہاں بھی اسلام بحیثیت ایک مذہب ہی کے رائج ہے۔ آج مذاہب کی کیا کیفیت ہو چکی ہے، اس کا نقشہ پروفیسر (HOCKING) نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

> یہ تمام مذاہب ٹوٹی ہوئی کشتیاں ہیں (جنہیں حوادث زمانہ کے طوفانوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ساحل پر پھینک دیا ہے) یہ سب اپنے اپنے تقدس کی چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اطمینان خویش نے (جو درحقیقت فریبِ نفس کا دوسرا نام ہے) ان کے متبعین کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے (جس کی وجہ سے انہیں حقیقت نظر ہی نہیں آ سکتی) ان کے عقاید و نظریات کے زنگ نے ان کے افکار و اعمال کے قبضوں کو اس قدر جام کر دیا ہے کہ ان میں اب حرکت کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یہ لوگ قدامت پرستوں کے کوڑوں سے اس قدر ڈرے سہمے رہتے ہیں کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سمجھ اور سوچ سے کام لینے کی جرأت کر سکیں۔

(LIVING RELIGIONS AND A WORLD FAITH.)

دنیا جس طرح اپنے وضع کردہ نظامہائے حیات سے تنگ آ چکی ہے اسی طرح موجودہ مذاہب سے بھی مایوس ہو چکی ہے ___ کاغذ کے پھولوں سے کوئی کب تک اپنا جی بہلا تا ہے؟ بایں ہمہ وہ اپنی نجات کا ذریعہ مذہب ہی سمجھتی ہے۔ اس کے لئے انہیں کس قسم کے مذہب کی تلاش ہے، اس کا تصور امریکہ کے ممتاز ماہرِ نفسیات (ERICH FROMM) نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے وہ کہتا ہے کہ وہ مذہب ___

> انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا جو مشرق و مغرب کی تمام تعلیمات کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ حیات دے گا جو علوم سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اسی نظام کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب

بن سکے۔

(THE SANE SOCIETY)

چونکہ اہلِ مغرب کے ہاں دین کا تصور نہیں، اس لئے ان کی زبان میں دین کی قرآنی اصطلاح کے ترجمہ کے لئے بھی کوئی موزوں لفظ نہیں ہے۔ جو کچھ میں نے پیش کیا ہے اس سے واضح ہے کہ مغرب کے دانشوروں کو "دین" کی تلاش ہے، مذہب کی نہیں (وہ تو پہلے ہی مذہب گزیدہ ہیں اور جسے مذہب کا بنجارہ خود اپنا ٹھاٹھ باٹھ سمیٹ کر رخصت ہونے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔ یہ جو اس وقت اس کا دھوم دھڑکا سنائی دے رہا ہے' وہ رقصِ بسمل سے زیادہ کچھ نہیں) لیکن اپنی زبان کی کوتاہ دامنی کی وجہ سے وہ اسے (RELIGION) ہی سے موسوم کرتے ہیں۔ دوسری طرف چونکہ خود ہمارے ہاں بھی دین کا تصور نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے، اس لئے ہم بھی اسلام کو ایک مذہب ہی

مناظرے اور مباحثے

کی حیثیت سے سمجھتے اور اسی حیثیت سے اسے دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اسلام کی سب سے بڑی خدمت اسی کو سمجھ رکھا ہے کہ دیگر اہلِ مذاہب کے ساتھ مناظروں اور مباحثوں کے ذریعے اسلام کی افضلیت ثابت کر دی جائے اور اپنی ان فتح مندیوں پر جشنِ مسرت منائے جائیں۔ عام لوگ تو ایک طرف رہے، ہمارے ہاں ایک شخص — مرزا غلام احمد قادیانی — نے مامور من اللہ ہونے کا دعوے کیا۔ اور اس ماموریت کا مقصد یہ بتایا کہ وہ آریوں اور عیسائیوں سے مباحثے کر کے اسلام کی افضلیت ثابت کرے گا۔ عیسائی پادریوں کو شکست دینے کے لئے اس نے نظریہ یہ پیش کیا کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔ اپنے اس کارنامے کو اس نے کسرِ صلیب (صلیب توڑ دینے) سے تعبیر کیا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ایک طرف وہ کاسرِ صلیب ہونے کے مدعی تھے اور دوسری طرف اُس کا صلیب کی محافظ سلطنتِ برطانیہ کی اطاعت کو مسلمانوں کا مذہبی فریضہ قرار دیتے تھے۔ وہ اپنی ان ظفرمندیوں کا ڈنکا بجاتے، دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور اس کے چند ہی سال بعد پہلی جنگِ عظیم میں صلیب پرستوں نے مسلمانوں کی رہی سہی قوت اور حشمت کا بھی تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ علامہ اقبالؒ نے امتِ مسلمہ کو مذہب پرستی کے اس مقدس فریب سے نجات دلانے کے لئے پاکستان کی آزاد مملکت کا تصور پیش کیا تھا

مملکتِ پاکستان میں مذہبیت

تاکہ اس میں پھر سے اسلام کو ایک دین (نظامِ حیات) کی حیثیت سے پیش کر کے، اقوامِ عالم کے اختیار کردہ دیگر نظاموں پر اس کی افضلیت ثابت کر دی جائے۔ لیکن وا حسرتا! کہ ان کے اس خواب کو مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داری اور ہمارے حکمرانوں کی ہوسِ اقتدار نے خواب پریشاں کر کے رکھ دیا۔ اور دین کے احیاء کے بجائے یہاں مذہب نے اپنا جال اور بھی شدت اور وسعت سے پھیلا دیا۔ حتےٰ کہ اب یہ پھندے اپنی انتہا تک پہنچ رہے ہیں۔ مذہب کا مقصود انفرادی جذبات کی تسکین ہوتا ہے جسے "ثواب" کے غلط مفہوم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مذہب کس طرح جذبات کی تسکین کا سامان بہم

پہنچاتا ہے اس کی تازہ ترین مثالیں ہمیں دو ایک حالیہ واقعات سے ملتی ہیں۔ اگلے دنوں پاکستان میں مسجد نبوی کے امام تشریف لائے۔ انہوں نے لاہور کی شاہی مسجد میں نماز جمعہ پڑھائی تو کم از کم پانچ لاکھ افراد نے اُن کی اقتدار میں نماز ادا کی۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ میں جمعہ کی نماز کا اتنا بڑا اجتماع اور کہیں نہیں ملتا۔ یہ ہے بھی قابلِ فہم۔ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس و اطہر سے ہماری عقیدت ہی نہیں، محبت کا تقاضا ہے کہ جس چیز کی حضورؐ کی طرف کسی انداز سے بھی نسبت ہو، وہ ہمارے نزدیک محبوب اور محترم بن جاتی ہے۔ ہم تو مکہ اور مدینہ طیبہ کی کھجوروں اور گٹھلیوں کو بھی یونہی نہیں پھینک دیتے۔ انہیں بھی زمین میں دفن کر دیتے ہیں کہ پامالی سے ان کی بے حرمتی نہ ہو۔ مسجد نبوی کے یہ امام مسلکِ اہلِ حدیث کے پابند ہیں اور اس باب میں سعودی آلِ سعود کی شدت کا سب کو علم ہے۔ ان کے عقیدہ کی رُو سے مزارات پر گنبد اور قبے تعمیر کرنا تو ایک طرف، وہ زمین سے ذرا سی اٹھی ہوئی پختہ قبر کو بھی بدعت قرار دیتے ہیں۔ ان کے اسی مسلک کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے جنت البقیع میں صحابہ کبارؓ تک کے مزارات کو زمین کے ساتھ ہموار کر دیا۔ (اِن امام صاحب نے تو معلوم نہیں اس باب میں کچھ ارشاد فرمایا تھا یا نہیں۔ ان کے بعد مسجد حرام (کعبہ) کے امام تشریف لائے تو انہوں نے اسی شاہی مسجد میں اپنے خطبہ جمعہ میں "قبروں کو پوجنے یا ان سے کچھ مانگنے کے رجحانات کو سراسر کفر قرار دیا" (نوائے وقت لاہور۔ ۲۰ مارچ ۱۹۷۶ء)۔ بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس پانچ لاکھ کے مجمع نے اس مسلک کے پابند امام کے پیچھے نماز ادا کر کے اپنے جذبات کی تسکین کر لی، اور اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر سیدھے سڑک کے اُس پار داتا گنج بخش علیہ الرحمتہ کے مزار پر حاضری کے لئے جمع ہو گئے جہاں ان کے عرس کی تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ اس تقریب میں مزار پر فاتحہ ہی نہیں پڑھی جاتی، اسے گلاب اور کیوڑے سے غسل دیا جاتا ہے۔ اس پر چادریں چڑھائی جاتی ہیں، منتیں مانی جاتی ہیں، سجدے کئے جاتے ہیں۔ پھر قوالیاں بھی ہوتی ہیں۔ اُنہی مسلمانوں نے جنہوں نے اس امام کے پیچھے، جو ان تمام بدعات کو کفر اور شرک سمجھتا تھا، نماز ادا کر کے اپنے جذبات کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا تھا (یقیناً ثواب حاصل کیا تھا)، داتا صاحب کے عرس کی ان رسومات میں شریک ہو کر بھی اپنے جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کر لیا۔ مذہب میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ جس حکومت کے زیرِ اہتمام شاہی مسجد کا اجتماع منعقد ہوا تھا اُسی کے زیرِ انتظام عرس کی یہ تقریبات بھی سرانجام پا رہی تھیں۔ کیونکہ امورِ مذہبی اور اوقاف دونوں حکومتِ پاکستان کے زیرِ تحویل ہیں ـــــ ان دونوں سے آگے بڑھ کر مجھے اس اضافہ کی اجازت بھی دیجئے کہ اسی شام جناح باغ کے اوپن ایئر تھیٹر میں روسی طائفہ کے ناچ گانے کا تماشہ بھی ہوا اور عجب نہیں کہ مملکت کے کسی وزیر نے اس کا بھی افتتاح کیا ہو۔ یہ سب کچھ اُس مملکت میں ہوا اور ہو رہا ہے جس کے آئین میں اسلام کو مملکت کا "مذہب" قرار دیا گیا ہے۔ اگر مملکت کا مذہب نہیں ـــــ دینؐ اسلام ہوتا تو اس میں اس قسم کی بوالعجبیوں کی گنجائش کیسے ہو سکتی تھی؟

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ مذہب میں دین "وعظ" بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کی مثالوں کی بھی کچھ کمی

اسلام وعظ بن گیا

نہیں۔ آپ حضرات میں (نوجوانوں کو چھوڑیئے) جو ذرا عمر رسیدہ ہیں وہ اگر اپنے حافظہ پر زور دیں گے تو انہیں یاد آجائے گا کہ وہ بچپن سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو جائے تو ان پر دنیا کی کوئی قوم غالب نہ آسکے۔ یہ وعظ مسجدوں اور اسٹیجوں سے بڑھتے بڑھتے عالمگیر اجتماعات تک آپہنچے۔ دو سال قبل اسی لاہور میں مسلم ممالک کے سربراہوں کی ایک مہتم بالشان کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں ہر مملکت کے نمائندہ نے مسلمانوں کے اتحاد اور امت کی وحدت پر خطبات دیئے۔ قرار دادیں پاس ہوئیں اور اس کے بعد یہ تمام سربراہ اسی طرح متفرق اور منتشر ہو گئے جس طرح اس کانفرنس میں شرکت سے پہلے تھے۔ اب اسی شان و شوکت سے سیرت کانگریس منعقد ہو رہی ہے جس میں مسلمانوں کی مختلف مملکتوں کے قریب ایک سو ممتاز مندوب شرکت فرما رہے ہیں۔ اس میں بھی ہر ایک کے خطاب کا مقطع کا بند یہ سنائی دیتا ہے کہ "رسولِ اکرمؐ نے چودہ سو برس قبل عالمی انسانی برادری کا جو تصور دیا تھا اگر آج دنیا بھر کے مسلمان اس پر عمل کریں تو مسلمان قوم پوری دنیا پر حاوی ہو سکتی ہے۔" (امام مسجد الحرام کا خطبہ جمعہ۔ بحوالہ نوائے وقت لاہور ۴؍ مارچ ۱۹۷۶ء)۔ سیرت کانگریس کے اجتماعات میں حسبِ معمول نہ صرف غلبۂ اسلام کے لئے دعائیں مانگی گئیں بلکہ مرکزی حکومتِ پاکستان کے مذہبی امور کے وزیر (مولانا) کوثر نیازی صاحب نے یہ اعلان بھی فرما دیا کہ :-

> ۱۹۷۶ء کا سال پاکستان کے لئے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ بلکہ یہ سال غلبۂ اسلام کا سال ہے۔ اور اس سال عالمِ اسلام کو کامل اتحاد نصیب ہوگا۔ اس سال باطل کی تمام قوتیں انشاء اللہ شکست کھائیں گی[1]۔[2]

(نوائے وقت لاہور۔ ۴؍ مارچ ۱۹۷۶ء)

اس پر یقیناً نعرہ ہائے تکبیر بلند ہوئے ہوں گے، اور جن کے گوشِ نصیحت نیوش ہوں گے، انہوں نے، مسجد سے ملحق مزارِ اقبالؒ سے اٹھتی ہوئی یہ دردناک صدا بھی سن لی ہوگی کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اُنہیں
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اُنہیں

ہم (دعاۃ بعزم تید) مذہب کے ہر گ حشیش کے رسیا، اس قسم کے سنہرے خوابوں میں مدہوش رہنے کے

ٹوئن بی کا اشتباہ

عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ دانشور، جن کی نگاہیں حقائق پر ہیں، دیکھیئے کہ وہ ہمارے متعلق کیا کہتے ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ ٹوئن بی عصرِ حاضر کا سب سے بڑا نامور مورخ ہے۔ وہ نیشنلزم پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

---

[1] یہ تو قابلِ فہم ہے۔
[2] ان پیش گوئیوں نے میرزا غلام احمد کی یاد تازہ کرا دی۔

مغرب میں بعض دوسرے تصورات بھی ہیں جن کا باعث فوز و فلاح ہونا بے حد مشکوک ہے۔ ان میں سے ایک ہماری نیشنلزم ہے۔ ترک اور بعض دیگر اسلامی ممالک نیشنلزم کے تصور سے بھی اسی طرح متاثر ہوتے جا رہے ہیں جس طرح اور مغربی تصورات سے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہئے کہ جن مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان، بلا لحاظ اختلاف نسل، رنگ، زبان، عادات وغیرہ محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں۔ ان میں بھی اگر نیشنلزم کا ایسا تنگ نظر عقیدہ رائج ہو گیا تو دنیا کا حشر کیا ہوگا؟ آج جبکہ مغربی صنعت کاری کی وجہ سے دنیا میں "فاصلہ" کا تصور آہستہ آہستہ مٹتا جا رہا ہے...... مسلمانوں کا اخوتِ باہمی کا عقیدہ یقیناً مغرب کی تنگ نظر قومیت پرستی کے عقیدہ سے کہیں بہتر ہے اور یہی عقیدہ موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ برعکس مغربی عقیدہ کے جس نے یورپ میں، محض قومیت کے معیار پر، درجنوں آزاد مملکتوں کو پیدا کر رکھا ہے جن میں سے ہر ایک' دوسری سے الگ ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کی جو حالت ہو چکی ہے، اس میں یورپ کے اندر کم وبیش چالیس آزاد مملکتوں کا وجود ایک ایسا بڑا خطرہ ہے جس کا کوئی علاج ہی نہیں ہو سکتا۔ خود یورپ کی تباہی کا تو یہ عالم ہے لیکن، یورپ کی تہذیب نے لوگوں کی آنکھوں کو ایسا چندھیا دیا کہ وہ اُس کے تصوراتِ حیات کو آنکھیں بند کئے اپناتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں کم از کم مسلمانوں سے تو یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنے عالمگیر مودت واخوت کے تصور کو چھوڑ کر یورپ کا ایسا تنگ نظری کا تصور اپنے ہاں رائج نہیں کریں گے ایک عالمگیر برادری کا تصور' ویسے تو فلاحِ انسانی کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے، لیکن اس ایٹم کے دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔

(THE WORLD AND THE WEST)

دانشورانِ مغرب تو ہم سے یہ توقعات وابستہ کرتے ہیں اور ہماری یہ حالت ہے کہ کوئی مسلم مملکت اپنی جداگانہ قومیت کو چھوڑ کر' وحدتِ امت کی طرف ایک قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔ ویسے' وعظ ان سے جتنے جی چاہے کرا لو۔

میرے ہاں عزیزانِ من! مغرب کے اکثر مفکرین و مصنفین آتے رہتے ہیں۔ میں اُن کے سامنے اسلامی نظام کے اساسی عناصر جب بھی پیش کرتا ہوں تو وہ کہا کرتے ہیں کہ ہمیں ان نظریات کے قابلِ قبول

ہونے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن ہمارے اس سوال کا آپ کے پاس کیا جواب ہے کہ مسلمان ان نظریات کو اپنے ایمان کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ لیکن کیا آپ بتائیں گے کہ سارے عالمِ اسلام میں نہیں کسی ایک مسلم ملک میں بھی یہ نظام عملاً قائم ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے تو فرمایئے کہ جب آپ اس نظام کو خود اپنے ہاں قائم نہیں کرتے یا قائم نہیں کر سکتے تو دنیا کو اس کی دعوت کس منہ سے دے سکتے ہیں؟ میں تو ایک طرف، ان کے اس سوال کا جواب نہ ہماری سربراہی کانفرنس دے سکتی تھی نہ سیرت کانگریس۔ نہ ہی وہ حکومت جس کے زیرِ اہتمام اس قسم کی تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔ ہم اس سوال کا جواب کیا دے سکیں گے جو خود اپنی مملکت میں بھی ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر ایک قوم نہیں بن سکے! عزیزانِ گرامی قدر! یاد رکھئے کسی نظریے کو محض وعظ و نصیحت کے ذریعے نہیں پھیلایا جا سکتا۔ اسے اگر عملی نظام کی شکل میں قائم کر دیا جائے تو اس کے خوشگوار نتائج دنیا کے لئے وجہِ کشش بن جاتے ہیں۔ خود حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں تیرہ برس تک قرآنی نظریات کی تبلیغ فرمائی۔ اور اس کی بڑی ضرورت تھی کیونکہ آپؐ کے مخاطبین میں سے کوئی بھی ان نظریات کو ماننا تو ایک طرف، پہچانتا تک نہیں تھا لیکن اس طریق سے تیرہ برس کے عرصہ میں ایک قلیل سی تعداد اسلام کی طرف آ سکی۔ مگر جب اس کے بعد حضورؐ نے اپنے مخلص اور صادق متبعین کی رفاقت سے اسلام کو بحیثیت ایک دین کے قائم کر دیا تو چند سال کے عرصہ میں يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کی عملی تصویر دنیا کے سامنے آ گئی۔ اور پھر جب یہ نظام ذرا آگے بڑھا تو عہدِ فاروقیؓ میں وہ ایران سے مصر تک ایک بحرِ مواج بن گیا۔ یوں دنیا فوج در فوج، دین کے حصار میں داخل ہوئی۔ اب بھی اگر کسی ایک خطۂ زمین میں یہ نظام عملاً قائم ہو جائے تو آپ دیکھیں گے کہ اقوامِ عالم جو اپنے بنائے ہوئے نظاموں سے اس درجہ تنگ آ چکی ہے، کس طرح لپک کر اس کی طرف بڑھتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر عقل کے تجرباتی طریق کی سست رفتاری سے ایسا ہو گا اور نہ معلوم اس میں زمانہ کو اور کتنی کروٹیں بدلنا اور نوعِ انسان کو کس قدر ہولناک تباہیوں میں سے گزرنا پڑے۔ اس میں وقت تو ضرور لگے گا لیکن انسانیت کو بالآخر یہ نظام اختیار کرنا پڑے گا کہ اس کے سوا اس کی فلاح و نجات کی کوئی شکل نہیں ہو گی۔ گوئٹے نے اپنے دوست (ECKERMANN) کے نام اپنے خط میں کس قدر صحیح لکھا تھا کہ:-

> اسلام کی تعلیم کبھی ناکام ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے تمام نظامہائے حیات کے باوجود اس سے آگے جا ہی نہیں سکتے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔

(بحوالہ خطباتِ اقبالؒ)

اور یہی ہے حضورؐ کے نبیٔ آخر الزمان ہونے کا مطلب اور ختمِ نبوت کا مفہوم۔ حضورؐ کی رسالت زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہے۔ دنیا کے آخری انسان کے لئے بھی حضورؐ ہی رسول ہیں۔ جو اس

حقیقت پر یقین نہیں رکھتا اور کسی دوسرے ظہور یا اس کے امکان کو تسلیم کرتا ہے وہ [illegible] پر اس کے ایمان کا دعویٰ باطل ہے۔ اس کا شمار امتِ محمدیہ میں نہیں ہو سکتا۔ یہ میرا ایمان ہے [illegible] کی قدر! اور اسی ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہونے کی میری آرزو ہے ؎

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

(٠)

میں نے اسی قسم کے ایک اجتماع میں اپنے ایک خطاب میں کہا تھا کہ عصرِ حاضر کی بے پناہ تاریکیوں میں نظامِ محمدی ہی وہ روشنی کا مینار ہے جو کشتیٔ انسانیت کو ساحلِ مراد کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ انسان کا موجودہ عالمگیر اضطراب، مایوسیوں کا مقامِ مرگ نہیں' امیدوں کی نشیدِ حیات ہے۔ یہ وہ خزاں ہے جو آنے والی بہار کے لئے طائرِ پیش رس ہوتی ہے۔ وہ آخرِ شب کی تاریکی ہے جس کے متعلق غالبؔ نے کہا تھا کہ ؎

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند وز خورشید نشانم دادند

دیکھنا یہ ہے کہ اس خورشیدِ جہانتاب کی پہلی کرنوں کی جبیں بوسی کی سعادت کس خطۂ زمین کے حصے میں آتی ہے۔ جس کے نصیب میں یہ سعادت ہو گئی' اسی کی قسمت میں نوعِ انسان کی امامت (LEADERSHIP) ہو گی۔

اور یہی ہے طلوعِ سحر کی وہ یقین آفریں امید جس کی وجہ سے میں ابھی تک جیتے ہوئے اس پیکرِ محبوبیت کا دامن تھامے بیٹھا ہوں کہ

ترے سوا کوئی شایانِ شانِ وفا بھی تو ہو!
میں تیرے در سے جو اٹھوں تو کس کے ہاں جاؤں؟

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۳۳/۵۶)

قرآنِ مجید اپنی تفسیر آپ کرتا ہے

○ — یہ الفاظ تو آپ نے اکثر سُنے ہوں گے لیکن ان کی عملی تعبیر کم دیکھنے میں آئی ہوگی۔
○ — مفکرِ قرآن پرویز صاحب گذشتہ چالیس سال سے قرآنِ مجید کو اسی انداز سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش میں مصروف چلے آ رہے ہیں۔
○ — اس کے لئے انہوں نے پہلے قرآن مجید کا ضخیم اور منفرد لغت مرتب اور شائع کیا۔
○ — پھر قرآن مجید کا مفہوم مرتب کیا جو تیس پاروں (تین جلدوں) میں شائع ہو چکا ہے۔
○ — قریب بیس سال سے مسلسل درسِ قرآن دیتے چلے آ رہے ہیں جو ٹیپ ریکارڈز میں محفوظ ہے۔
○ — اب انہوں نے اس تمام تحقیق اور کاوش کے بعد قرآنِ مجید کی مسلسل تفسیر کا سلسلہ

مطالب الفرقان

کے نام سے شروع کیا ہے۔

○ — اس تفسیر میں زندگی کے اہم مسائل اور ہمارے زمانے کے تقاضوں کا حل، قرآنِ مجید اور عصرِ حاضر کے علوم کی روشنی میں نہایت وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔
○ — جلد اول حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ ضخامت قریب چار سو صفحات۔ سفید کاغذ۔ آفسٹ کی چھپائی۔ دیدہ زیب سنہری جلد — قیمت ○ — چالیس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

حقائق و عبر

۱۔ سوشلزم سے آگے

قرآنی کریم کا معاشی نظام تین بنیادی عناصر پر مشتمل ہے۔

۱۔ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا مملکت کی ذمہ داری ہے۔

۲۔ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتی ہے جب وسائلِ رزق اس کی تحویل میں ہوں۔ اور

۳۔ افرادِ معاشرہ اپنی صلاحیتوں اور استعداد کے مطابق پوری پوری محنت کریں اور اسکے حاصل سے (مملکت کے انتظام کے مطابق) بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی، دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے مملکت کی تحویل میں دے دیں۔

ظاہر ہے کہ یہ نظام اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب جملہ افرادِ مملکت (جن میں ارباب حل و عقد اولاً شامل ہیں) خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل، مستقل اقدار اور حیاتِ آخرت پر ایمان رکھیں اور اپنی پوری کی پوری زندگی کو ان قوانین و اقدار کے تابع رکھیں۔ اس لئے کہ معاشی نظام کو باقی دوائرِ حیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اور قرآن کریم انسان کی پوری کی پوری زندگی کا ارتقاء چاہتا ہے، محض روٹی کا مسئلہ حل نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک روٹی کا مسئلہ مقصود بالذات ہے بھی نہیں۔ وہ زندگی کے بلند مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔

اشتراکی نظام، وسائلِ رزق کو تو اپنی تحویل میں لے لیتا ہے لیکن افراد کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اس وقت تک کسی اشتراکی مملکت نے یہ ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ ملک ایک بہت بڑا جیل خانہ بن کر رہ جاتا ہے — بلکہ اس سے بھی بدتر کیونکہ جیل خانے میں بھی قیدیوں کو روٹی بہم پہنچانا اربابِ جیل کے ذمہ ہوتا ہے۔ ہم شروع سے سوشلزم کی مخالفت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک تو اس لئے کہ سوشلزم معاشی نظام ہی نہیں، وہ ایک فلسفۂ زندگی ہے جو اسلام کے فلسفۂ زندگی کے متضاد ہی نہیں، اس سے متخاصم ہے۔ ہمارے ہاں کے اشتراکیت کے حامیوں نے کبھی ان اعتراضات کا جواب نہیں دیا جو اس باب میں ہم پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ نہ ہی ان میں سے کسی نے یہ کہا کہ ....

افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت کے سر ہوگی۔ اب اس سلسلہ میں ایک ایسی بات سامنے آئی ہے جس کا تذکرہ ضروری ہے۔

وزیرِ اعظم بھٹو نے، ۲۹ جنوری ۱۹۷۶ء کو مصر کے ایک نامور صحافی کو (جو اجیپشین گزٹ اور اجیپشین میل کے ایڈیٹر ہیں) ایک انٹرویو دیا۔ اس میں ذیل کے سوال و جواب موضوعِ زیرِ نظر سے متعلق ہیں۔

سوال:- حکومتِ پاکستان نیشنلائزیشن کی پالیسی پر کس حد تک یقین رکھتی ہے؟

جواب:- اصل یہ ہے کہ ہر ملک کے اپنے اپنے تجربات اور اپنے اپنے حالات ہوتے ہیں۔ آپ کے سوال کا بنیادی طور پر تعلق اس بات سے ہے کہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریات بہم پہنچانے کی ذمہ داری کس حد تک مملکت پر عاید ہوتی ہے، کیا مملکت اس ذمہ داری کو قبول کرتی ہے یا وہ سمجھتی ہے کہ اپنی ضروریات کا پورا کرنا، افراد کی اپنی ذمہ داری ہے۔ ہمارے خیال میں افرادِ معاشرہ کی ضروریات بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت کو اپنے سر پر لینی چاہیئے۔ اسے یہ ذمہ داری کسی اور کی طرف منتقل نہیں کرنی چاہیئے۔ یہ ہے بنیادی پوزیشن۔ اس کے ساتھ ہی' ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ افرادِ معاشرہ کو اس کی آزادی ہونی چاہیئے کہ وہ اپنی صلاحیتوں، اپنے افکار و تخیلات، اپنی محنت شاقہ، اپنی دولت اور مساعی کو خود استعمال کر سکیں اور مملکت کی فلاح و بہبود میں اس کا ہاتھ بٹا سکیں۔

(بحوالہ پاکستان ٹائمز، مورخہ ۱۹ فروری ۱۹۷۶ء)

اس جواب میں ابہام تو ہے لیکن یہ پہلی بار ہے جو محترم وزیرِ اعظم نے اس امر کا اعتراف اور اعلان کیا ہے کہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا مملکت کی ذمہ داری ہے۔ یہ بہت بڑا اعلان اور بڑی عظیم ذمہ داری ہے۔ اگر محترم موصوف اسے عملاً متشکل کر سکیں تو یہ قرآن کریم کے معاشی نظام کی طرف مستحسن اقدام ہوگا۔ لیکن یہ اقدام قرآن کی منشا اور تعلیم کے مطابق اسی صورت میں ہو سکے گا جب ایسی مشینری نصب کی جائے کہ اگر مملکت اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے میں قاصر رہے تو اس سے اس کی باز پرس کی جا سکے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر اس قسم کے اعلانات اور مواعید خالی "وعظ" بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ وسائلِ رزق کو اپنی تحویل میں لینا اس مقصد کے لئے ہے کہ مملکت، افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے جو مملکت ایسا نہ کرے۔ قرآن کی رُو سے اُسے وسائلِ رزق کو اپنی تحویل میں لینے کا حق نہیں پہنچتا۔

---- (-) ----

۲۔ مصلحتی اسلام

جب یہاں زمینداروں اور جاگیرداروں کا زور تھا اور انہیں خطرہ تھا کہ زرعی اصلاحات کے تحت ان کی ملکیتوں پر زد پڑ جائے' تو اس وقت یہ فتویٰ دیا گیا کہ:-

آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے' یہ ہے کہ اسلام کے

حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیت پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عاید کر سکتے ہیں اور نہ ہی ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں ...... اسلام ہم سے قطعاً یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو ...... (نہ یہ کہتا ہے کہ) زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے ۔ اور یہ کہ اجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوق ملکیت حاصل ہی نہیں ...... اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے ۔

(مسئلہ ملکیت زمین ۔ از ابو الاعلیٰ مودودی صفحہ ۷۲-۷۳ ۔ ایڈیشن ۱۹۵۰ء)

انہوں نے یہاں تک بھی کہہ دیا کہ :۔

اسلامی شریعت تمام افراد کی تو ایک طرف، کسی ایک فرد کی ذاتی ملکیت کو اس طرح ساقط کر دینے یا اس کو اپنے املاک کی فروخت پر مجبور کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتی ۔

(ترجمان القرآن ۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء ۔ صفحہ ۵)

اس کے بعد ۱۹۷۰ء کے انتخابات کا زمانہ آیا تو پیپلز پارٹی نے اپنے منشور میں لکھ دیا کہ اراضیات کے رقبوں پر تحدید کر دی جائے گی اور اس طرح حاصل کردہ رقبوں کو کاشتکاروں یا چھوٹے چھوٹے زمینداروں میں تقسیم کر دیا جائے گا ۔ ظاہر ہے کہ اس اسکیم کا ووٹنگ پر بڑا اثر پڑنا تھا ۔ اس ضرورت کے پیش نظر اسلام میں یہ تبدیلی کی گئی کہ :۔

قدیم املاک کے معاملہ میں زمین کی ملکیت کو ایک خاص حد تک محدود کر دیا جائے گا ۔ مغربی پاکستان کے زرخیز علاقوں میں یہ حد زمین کی پیداواری صلاحیت کے لحاظ سے سو (۱۰۰) اور دو سو ایکڑ (۲۰۰) کے درمیان ہوگی ۔ اور جن علاقوں میں زمین کی پیداواری صلاحیت بہت کم ہے وہاں اس معیار کے لحاظ سے حد مقرر کی جائیگی ۔ مشرقی پاکستان میں سو (۱۰۰) بیگھ کی حد رکھی جائے گی ۔ اس سے زاید ملکیتوں کو منصفانہ شرح پر خرید لیا جائے گا ۔

(جماعت اسلامی کا انتخابی منشور)

مودودی صاحب کے مصاحبوں میں سے کسی کو شریعت میں اس طرح ترمیم کرنے کے خلاف اعتراض کرنے کی جسارت نہ ہوئی ۔ نہ ہی یہ پوچھنے کی جرأت کہ آپ کا وہ قطعاً اب حکمت میں کیسے بدل گیا ۔ جرأت ہو بھی کیسے سکتی ؟ ۔۔ زر بر سر فولاد نہی، نرم شود ۔۔ لیکن اب ایک بھولی بھالی طالبہ نے

۔ جو ہنوز حصولِ اقتدار سے نا واقف تھی ۔ یہ اعتراض کر دیا۔ ہوا یوں کہ جمعیت طالبات کے سالانہ کنونشن کی تقریب پر مودودی صاحب نے طالبات سے خطاب کیا۔ خطاب کے بعد "سوال ۔ جواب" کے سلسلہ میں ایک طالبہ نے یہ سوال کر دیا کہ :۔

> اسلام میں جائداد کی حد مقرر نہیں ہے۔ جماعت اسلامی نے یہ حد مقرر کر دی ہے۔
> کیا یہ شریعت میں ترمیم نہیں ؟

اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا۔

> جس ملک میں مدتِ دراز سے غلط نظام رائج رہا ہے، ملکیتی نظام درہم برہم ہو چکا ہے وہاں ایسے اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔ اسلام میں یقیناً جائز ملکیت تحدیداً جائز نہیں ہے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہاں مغلوں کے دورِ حکومت میں غلط بخشیاں ہوئیں، جائز حقوق چھین کر غیر مستحق لوگوں کو نوازا گیا۔ سکھوں کے دور میں جو کچھ ہوا وہ بھی آپ جانتے ہیں۔ انگریزی دور میں ان تمام لوگوں کو جو ملک، قوم کے حامی اور وفادار تھے انہیں غداری کے الزامات میں سزائیں دی گئیں۔ ان کی جائیدادیں ضبط کی گئیں۔ یہ بہت بگڑا ہوا نظام ہے۔ جہاں بے جا اونچ نیچ، ظلم و ستم کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے۔
>
> اس نظام کو درست کرنے کے لئے بہت غور کرنے کے بعد عارضی طور پر یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ نظامِ حق قائم ہونے کے بعد صحیح طریقہ سے ملکیت حاصل کرنے پر کوئی پابندی عاید نہیں کی جائے گی۔ بگڑے ہوئے حالات میں ایسی ترمیمات کرنا پڑیں گی، جن سے ظلم کا خاتمہ ہو۔

(ایشیا۔ مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۷۰ء۔ صلہ)

آپ نے دیکھا کہ اس جواب میں کس "سادگی و ہشیاری" سے ادھر اور ادھر دونوں طرف کی گنجائش رکھ لی گئی ہے؟ اسے کہتے ہیں "حکمت عملی" جو مودودی صاحب کے اسلام کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ شریعتِ حقہ کے ساتھ اس قسم کا مذاق بھی کم ہی کہیں ہوا ہوگا!

―――― (٥) ――――

۳۔ تہذیبِ فرنگ

علامہ اقبالؒ نے تہذیبِ فرنگ کے متعلق کہا تھا کہ

> چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!

اس کا عملی ثبوت ایک ایسے مقالہ سے سامنے آیا ہے جو بیک وقت حیرت آمیز بھی ہے اور دہشت انگیز بھی۔ مقالہ نگار کا نام ہے (CATHERINE POZZO-DI-BORGO)۔ اور یہ شائع ہوا تھا

ڈان (کراچی) کی اشاعت بابت ۲۰ ستمبر ۱۹۷۵ء میں۔ ذیل میں اس کا ملخص درج کیا جاتا ہے۔

۲۸ نومبر ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ (FRANK OLSON) نامی، کیمسٹ نے جس کی عمر ۴۳ سال کی تھی، نیویارک کے ایک ہوٹل کی دسویں چھت سے کود کر خودکشی کر لی۔ اس سے چند ماہ قبل ٹینس کے نامور کھلاڑی (HERAL BLAUER) کا ایک سائیکیاٹریٹ انسٹی ٹیوٹ میں عارضۂ قلب سے انتقال ہو گیا۔ امریکہ (بلکہ یورپ کے بھی) مختلف شہروں میں اس قسم کے واقعات روزانہ ہوتے رہتے ہیں اس لئے ان حادثات کو بھی کوئی خصوصی اہمیت نہ دی گئی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

دو ایک سال ادھر کی بات ہے امریکہ میں ایک کمیشن (ROCKEFELLER COMMISSION) بدیں مقصد متعین ہوا کہ وہ تحقیق کرے کہ امریکہ کی مشہور رسوائے زمانہ تفتیشی ایجنسی (C.I.A) کس قسم کے کارنامے سرانجام دیتی ہے اور ان کے لئے کس کس قسم کے حربے استعمال کرتی ہے۔ دوران تحقیق یہ معلوم ہوا کہ یہ ایجنسی (علاوہ دیگر حربوں کے) یہ تجربات بھی کرتی رہی ہے کہ مختلف نشہ آور اشیاء (مثلاً L.S.D.) کے انسانوں پر اثرات کس قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۳ء تک ان تجربات میں مصروف رہی اور اس دوران میں قریب پندرہ سو افراد پر (جن میں خود C.I.A. کے ملازم بھی شامل تھے) یہ تجربات کر چکی ہے۔ اور یہ سب کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ جن افراد پر ان کا تجربہ کیا جاتا انہیں اس کا مطلقاً علم نہ ہونے پاتا۔ ان تجربات سے اس امر کا انکشاف ہوا کہ اس دوائی کا اثر یہ بھی ہے کہ انسان کے دل میں غیر شعوری طور پر خودکشی کرنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے، یا وہ ایسی افسردگی پیدا کر دیتی ہے جس سے حرکت قلب بند ہو جاتی ہے۔ تحقیق نے بتایا کہ (OLSON) اور (BLAUER) کی اموات انہی تجربات کا نتیجہ تھیں۔ ابھی تک اس راز سے پردہ نہیں اٹھا کہ (C.I.A) اس مخفی طریق سے کس قدر انسانی زندگیاں تلف کر چکی ہے۔ ان تجربات سے وہاں کی آرمی بھی بہت خوش تھی کیونکہ ایک ریٹائرڈ جرنیل کے الفاظ میں، اس سے گولی بارود چلائے بغیر، دشمن پر فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔

یہ ہے اس خدا فراموش تہذیب کے کارناموں کی ایک جھلک جسے نوعِ انسان کی ترقی کی معراج قرار دے کر ساری دنیا میں اس کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ اور پسماندہ اقوام غیر شعوری طور پر اسی کی طرف کھنچے چلی جا رہی ہیں۔ کس قدر صحیح کہا تھا اس دیدہ ور نے کہ

ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش[1]
اور تو اسے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات

(۰)

---

[1] برگِ حشیش، بھنگ کو کہتے ہیں جس سے حسن بن صباح نوجوانوں کو مدہوش کیا کرتا تھا۔ (L.S.D. پر یہ تشبیہ کیسی فٹ بیٹھتی ہے۔

۴۔ دیوِ استبداد

جب دنیا میں جمہوریت کا چرچا عام ہوا تو علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

نظامِ جمہوریت کو کارفرما ہوتے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ اس کی قبا، تارتار ہونی شروع ہوگئی ہے اور اس کے اندر چھپا ہوا دیو استبداد' برہنہ ہوکر سامنے آرہا ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال، ہمارے ہمسایہ ملک (بھارت) کی ہے۔ لندن سے شائع ہونے والے جریدہ (ECONOMIST) نے اپنی ۲۲ جنوری ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں، وہاں کے سیاسی حالات' اور ہنگامی قوانین کے عواقب پر معلومات افزا تبصرہ شائع کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہاں' دو ماہ کے عرصہ میں' قریب اسی ہزار افراد گرفتار کئے گئے ہیں۔ اور اس طرح سیاسی محبوسین کی تعداد ایک لاکھ چالیس ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ان جماعتوں کے علاوہ جو حکومت کی کھلے بندوں مخالفت کرتی ہیں' وہاں کی زیرِ زمین تنظیمیں بڑی شدت اور وسعت اختیار کر رہی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت جن سنگھ اور اس کی ملحقہ پارٹی (R. S. S.) کو حاصل ہے۔ ان کے ارکان کی تعداد ایک کروڑ کے قریب ہے جن میں سے اسی ہزار کے قریب باقاعدہ مسلح ہیں۔ ان کی طرف سے حکومت کے خلاف پراپیگنڈہ کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس مقصد کے لئے (۲۷) اخبارات زیرِ زمین کام کر رہے ہیں۔

اِدھر یہ کچھ ہو رہا ہے' اور اُدھر وہاں کی "بھیرون دیوی" گلے میں انسانی کھوپڑیوں کا ہار لٹکائے اور خون آلود زبان نکالے' ملک میں بگولے کا سا رقص کر رہی ہے — اور اس کا نام رکھا جاتا ہے' آزادی!

یاد رکھیئے۔ آزادی صرف اسے کہا جا سکتا ہے جس میں کسی انسان کو دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہ ہو' اور حکمرانی صرف قوانینِ خداوندی کی ہو۔ اس کے سوا' آزادی کا ہر دعوےٰ باطل' اور ہر نظام سراب ہے۔

۵۔ جنسی لذت سے بلند

(HUDDERSFIELD) کے ڈاکٹر (S. H. SMITH) کا ایک مختصر سا مقالہ' شیفیلڈ (انگلستان) کے جریدہ (STAR) کی ۲۹ جنوری ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "دنیا میں جنسی اختلاط ہی ٹانک نہیں"۔ وہ اس میں لکھتے ہیں کہ یہ بات ایک مسلمہ کی سی حیثیت

اختیار کر گئی ہے کہ جنسی اختلاط کے بغیر مردوں اور عورتوں کا گزارہ ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم اس فریب تخیل سے نکل کر سوچیں اور کسی ایسی شے کی تلاش کریں جو اس سے بہتر ہو۔ جنسی اختلاط کی صحیح پوزیشن تو اتنی ہی ہے۔ کہ فطرت نے بقائے نسل کی خاطر اسے جاذب بنا دیا ہے، ورنہ اس عمل میں ایسے عناصر ہیں جنہیں غیر انسانی بلکہ ذلت آمیز کے سوا کسی نام سے پکارا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ مسلسل پراپیگنڈہ نے یہ خیال ہمارے دل میں راسخ کر دیا ہے کہ ازدواجی زندگی کیلئے جنسی اختلاط لابدی ہے۔ اس کے بعد وہ سوال کرتا ہے کہ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ زندگی میں اس سے بلند مقصد کوئی ... ہے ہی نہیں؟

آخر میں وہ کہتا ہے کہ ازدواجی زندگی میں، جسمانی ملابست سے کہیں زیادہ اہم فکری رفاقت، روحانی وحدت اور جذباتی ہم آہنگی ہے۔

قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے، ازدواجی رشتہ کے لئے فکری ہم آہنگی اور نظریاتی یک رنگی کو بنیادی شرط قرار دیا تھا، اور اس کا نتیجہ باہمی مودت، سکینت اور رحمت بتایا تھا۔

دنیا قرآن کی طرف آرہی ہے اور ہمارا نوجوان طبقہ، یورپ کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کی طرف لپک کر جا رہا ہے۔ لیکن اس میں بھی قصور ہمارا ہی ہے کہ ہم نے اسے صحیح تعلیم و تربیت سے محروم رکھا ہے۔

(۰)

۶۔ قوم کو دھوکے میں نہ رکھئے

ادارہ تحقیقات اسلامی کے ترجمان ماہنامہ "فکر و نظر" نے مارچ ۱۹۷۶ء میں "سیرۃ النبیؐ نمبر" شائع کیا ہے۔ اس کے "نظرات" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ

> گذشتہ دنوں وزیر اعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے میرپور خاص (سندھ) کی ایک تقریب میں فرمایا کہ کراچی سے خیبر تک ہم سب ایک قوم ہیں اور ایک ہی رہیں گے۔

ہم متعدد بار اس حقیقت کو وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ جس طرح چار قومیتوں کا نظریہ اسلام اور پاکستان کے خلاف ہے اسی طرح ایک قوم کا نظریہ بھی ان دونوں کی نقیض ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کراچی سے خیبر تک میں بسنے والے تمام مسلمان ایک قوم کے افراد ہیں تو یہ اعلان اسلام اور نظریۂ پاکستان دونوں کے مطابق ہوگا۔ لیکن مسلمان کی تخصیص کے بغیر اگر یہاں کے باشندوں کو ایک قوم کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس مملکت میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم، اشتراک وطن کی بنا پر ایک قوم تسلیم کئے جاتے ہیں۔ یہ نظریہ اسلام کے بھی خلاف ہے اور پاکستان کی جداگانہ مملکت کے تصور کو بھی جڑ بنیاد سے اکھیڑ دینے کا موجب۔ آج تو ہم اس کے تباہ کن نتائج کو محسوس نہیں کر رہے۔ لیکن آنے والی نسلوں کے ذہن میں جب یہ نظریہ راسخ ہو گیا تو وہ تقسیم ہند کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں پا

پا سکیں گے ۔ اور بھارت کا پراپیگنڈہ انہیں بڑی آسانی سے اپنی طرف کھینچ لے گا ۔ بہی خواہان پاکستان کے لئے اشد ضروری ہے کہ وہ پاکستان کے تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دینے کے نظریہ کی کھلے الفاظ میں تردید کریں ۔

(۲) ماہنامہ فکر و نظر نے آگے چل کر کہا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں رشتہ وحدت اسلامی قومیت ہے ۔ یہ بالکل صحیح ہے ۔ یہی قرآن کریم کی بنیادی تعلیم ہے اور پاکستان کی جداگانہ مملکت کی اساس ۔ لیکن دو ہی قدم آگے چل کر اس موقر جریدہ نے جو کچھ کہا ہے وہ غلط فہمی پر مبنی ہے اور قوم کو فریب میں رکھنے کا موجب ۔ کہا یہ گیا ہے کہ

> یہ درست ہے کہ دنیا کے مسلمان اس وقت متعدد وحدتوں میں منقسم ہیں ۔ لیکن اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ ایک ہیں اور ان کا نفع و نقصان بھی ایک ہے ۔

ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں ۔ اور ہم اس کے متعلق کئی بار وضاحت بھی کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کے امت واحدہ بننے کے لئے جو پروگرام بھی تجویز کیا جائے گا اس میں سردست مسلمانوں کی جداگانہ مملکتوں کے وجود کو برقرار رکھا جائے گا تا آنکہ وہ آہستہ آہستہ ایک عالمگیر مملکت میں تبدیل ہو جائیں ۔ لیکن "فکر و نظر" نے جو یہ کہا ہے کہ اس وقت مسلمان جو متعدد وحدتوں میں منقسم ہیں اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ ایک ہیں اور ان کا نفع نقصان بھی ایک ہے ۔ یہ بات خلافِ واقعہ ہے ۔ اس وقت نہ دنیا کے مسلمان مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک ہیں ، نہ ہی ان کا نفع نقصان ایک ہے ۔ (مثلاً) حال ہی میں صحرائے افریقہ سے پرتگال دست کش ہوا ہے تو وہاں مراکش اور الجزائر کی فوجیں ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہو گئی ہیں ۔ کیا جریدہ فکر و نظر بتائے گا کہ ان دونوں کا نفع نقصان ایک ہے ؟ وہاں سے ہٹ کر اپنے گھر کے قریب آجائیے ۔ افغانستان ہمارا سب سے قریبی مسلمان ہمسایہ ہے ۔ کیا اس کا اور ہمارا نفع نقصان ایک ہے ؟ اور سمٹ آئیے ۔ کیا (سابقہ) نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) اور پیپلز پارٹی کا نفع نقصان ایک تھا ؟ خود پیپلز پارٹی کے اندر بھی مختلف گروہ بندیاں ہیں کیا ان کا نفع نقصان ایک ہے ؟ یا کیا برسر اقتدار پارٹی اور حزب مخالف کا نفع نقصان ایک ہے ؟ اور آگے بڑھئے اور یہ فرمائیے کہ کیا مسلمان زمیندار اور مسلمان کاشتکار یا مسلمان صنعت کار اور مسلمان محنت کش کا نفع نقصان ایک ہے ؟ ظاہر ہے کہ ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے ۔ واقعہ یہی ہے کہ دنیا میں بسنے والے ستر (۷۰) کروڑ مسلمان کہلاتے تو مسلمان ہی ہیں لیکن نہ ان سب کا نفع ایک ہے نہ نقصان ایک ۔ لہٰذا بحالات موجودہ یہ کہنا کہ متعدد وحدتوں میں منقسم مسلمانوں کا نفع نقصان ایک ہے حقیقت کے خلاف ہے ۔ ضرورت ہے کہ قوم کو اس فریب سے نکالا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ اگر مسلمانوں کا نفع نقصان ایک نہیں تو ان کا دعوائے اسلام باطل ہے ، خود فریبی ہے ۔

۷۔ یہ کہاں کی دوستی ہے؟

جب ہم نے اخبارات میں یہ پڑھا کہ عالمی سیرت کانگرس میں یورپ اور امریکہ کے مستشرقین بھی شریک ہو رہے ہیں تو ہمارا ماتھا ٹھنکا تھا، کیونکہ یہ لوگ اپنی مصلحت کے خلاف، اور تو اور عیسائیت پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ چنانچہ جلد ہی واضح ہو گیا کہ ہمارا یہ اندیشہ بیجا نہیں تھا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ جب روس کا ہوا امریکہ کے سر پر سوار ہوا تھا تو امریکہ کی سیاسی مصلحتوں کا تقاضا تھا کہ روس کی مخالفت میں مسلمان مملکتیں اُس کا ساتھ دیں۔ اس تقاضے کے پیشِ نظر وہاں سے ایک نعرہ بلند ہوا تھا کہ:۔

> دنیا کے خدا پرستو! آؤ اور ہمارے ساتھ مل کر الحاد اور بے دینی کے خلاف متحدہ محاذ بناؤ۔

ہم نے اسی زمانہ میں واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ یہ دعوت، مسلمانوں کو اپنا آلۂ کار بنانے کے لئے ہے۔ ہم نے کہا یہ تھا کہ اگرچہ (ان لوگوں کو چھوڑ کر جو اعلانیہ خدا کی ہستی کا انکار کرتے ہیں) دنیا بھر کے غیر مسلم خدا پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں۔ لیکن قرآن ان کے اس ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ اسی لئے وہ انہیں اُس خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ جس کا تصور قرآن پیش کرتا ہے۔ اس بنا پر مسلمان، امریکہ اور یورپ کے عیسائیوں کو خدا پرست تسلیم کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو سکتے۔

عالمی سیرت کانگرس میں یونیورسٹی آف اڈنبرا کے شعبۂ اسلامیات کے پروفیسر، ڈبلیو، منٹگمری واٹ شریک ہوئے ہیں۔ انہوں نے ۶ مارچ ۱۹۷۶ء کو اپنے خطاب کے دوران کہا:۔

> اس وقت نوعِ انسانی اخلاقی اور ثقافتی سطح پر ایک نہایت نازک صورت حال سے دوچار ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے فرزندانِ توحید کی طرف سے زیادہ سے زیادہ تبلیغ میسر آسکے تاکہ عیسائی اور مسلمان اپنے مشترکہ دشمن "الحاد" کے خلاف مل کر جہاد کر سکیں۔

(نوائے وقت لاہور۔ ۷ مارچ ۱۹۷۶ء)

آپ نے دیکھا کہ یہ اُسی نعرہ کی صدائے بازگشت ہے جو اُس زمانے میں امریکہ سے بلند ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآنی معیار کی رُو سے عیسائی بھی اُسی طرح خدا کے منکر ہیں، جس طرح روس والے ہیں۔ دوسرے یہ کہ عیسائی مملکتوں نے جو کچھ مسلمانوں کے خلاف کیا ہے، جو کچھ وہ اب بھی کر رہی ہیں، اور جو کچھ کرنے کے وہ عزائم رکھتی ہیں، اُسے ہم نہ بھولے ہیں نہ بھولا

طاقت صحت

اور **بھرپور توانائی** کیلئے

ہمیشہ **اوولٹین** استعمال کیجئے!

OVALTINE

خالد برادرس۔ پی۔ او۔ بکس نمبر 8026 کراچی

مودودی صاحب اور علامہ اقبالؒ

کچھ عرصہ اُدھر کا ذکر ہے کہ ملک میں اس بات کا عام چرچا کیا گیا کہ علامہ اقبالؒ کے مودودی صاحب کے ساتھ بڑے گہرے تعلقات تھے۔ انہوں نے مودودی صاحب کو حیدرآباد (دکن) سے پنجاب آ جانے کی دعوت دی تھی۔ اور دارالاسلام (پٹھانکوٹ) بھیجا تھا کہ وہ وہاں اطمینان سے بیٹھ کر فقہ جدید مرتب کریں اور دیگر اہم اسلامی موضوعات پر ریسرچ کریں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے مودودی صاحب خود تو اس باب میں خاموش رہے اور یہ چرچا ان کے مصاحبوں کی طرف سے ہوتا رہا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد فضا کی پہنائیوں میں گم ہو گیا۔

کراچی کے ایک نوجوان طالب علم علامہ اقبالؒ کی زندگی سے متعلق کوائف جمع کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں مودودی صاحب کو بھی لکھا کہ وہ حضرت علامہ کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچائیں۔ اس طالب علم نے یہ خط و کتابت ہمیں بھیجی ہے کہ اسے طلوع اسلام میں شائع کیا جائے۔ اس کا مقصد اس مقالہ کے آخر میں درج ہے۔ آپ وہ خط و کتابت ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) مکتوب نگار کا خط مودودی صاحب کے نام

مولانائے محترم! السلام علیکم۔

میں علامہ اقبالؒ کے کوائفِ حیات سے دلچسپی رکھتا ہوں اور اس سلسلے میں ضروری مواد اکٹھا کر رہا ہوں۔

آپ کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ آپ ان کی دعوت پر ۱۹۳۷ء کے آخر میں حیدرآباد سے دارالاسلام (پنجاب) تشریف لائے تھے۔ علامہ اقبالؒ کی وفات اپریل ۱۹۳۸ء میں ہو گئی تھی۔ کیا آپ براہِ کرم یہ فرمائیں گے کہ اس دوران میں آپ کتنی بار حضرتِ علامہ سے ملے اور کب؟ نیز یہ بھی کہ آپ نے ان کی وفات پر کہیں کچھ لکھا تھا یا نہیں؟ اگر کچھ لکھا تھا تو کس پرچہ میں؟ اور اس کا حوالہ کیا ہے؟

ہیں شکر گذار ہوگا اگر آپ ان مختصر سے سوالات کا جلد جواب عنایت فرمائینگے۔
والسلام

(۲) مودودی صاحب کا جواب

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔
عنایت نامہ ملا۔ میں ۱۹۳۷ء کے ماہ اگست میں یا شاید ستمبر میں دو مرتبہ علامہ اقبالؒ مرحوم سے لاہور میں ملا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ انہی کی تحریک و ترغیب پر میں حیدر آباد دکن سے دارالاسلام، پٹھان کوٹ (مشرقی پنجاب) منتقل ہوا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ جس مہینے میں دارالاسلام پہنچا اس کے بعد دوسرے ہی مہینے علامہ مرحوم کا انتقال ہوگیا۔ اسی زمانے میں ان کی وفات پر میں نے رسالہ ترجمان القرآن میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس وقت متعین طور پر یاد نہیں ہے کہ کس شمارہ میں وہ شائع ہوا تھا۔ کراچی میں حکیم نعیم الدین زبیری صاحب نے ترجمان کا انڈکس تیار کیا ہے۔ آپ ان سے معلوم کرلیں۔ ان کا پتہ یہ ہے۔

جناب حکیم نعیم الدین زبیری صاحب
۵-سی، ۲۱-۱ ناظم آباد، کراچی ۱۸

خاکسار
ابوالاعلیٰ

مکتوب نگار نے ہمیں لکھا ہے کہ مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق وہ حکیم نعیم الدین زبیری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علامہ اقبالؒ کی وفات کے سلسلہ میں، مودودی صاحب کے (مبینہ) مضمون کے متعلق وہ متعین طور پر کچھ نہ بتا سکے۔ البتہ انہوں نے دو ایک حوالے دیئے کہ شاید ان میں کچھ مل جائے۔ ان حوالوں میں، اس موضوع پر کچھ نہیں تھا۔ البتہ ترجمان القرآن بابت محرم ۱۳۵۷ھ کے "اشارات" میں حضرت علامہ کی وفات کا ذکر ضمناً موجود ہے۔ وہ "اشارات" ذیل میں درج ہیں۔

ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۵۷ھ - جلد ۱۲، عدد ۱
"اشارات" صفحہ ۲ - ۳

اس اشاعت سے "ترجمان القرآن" کی زندگی کا چھٹا سال شروع ہو رہا ہے۔ پچھلے سال کے آغاز میں جو دعا میں نے اپنے مالک سے مانگی تھی، اس وقت ذہن میں اس امر کا تصور بھی نہ تھا کہ سال پورا ہونے سے پہلے ہی ایک ٹوٹی ہوئی کشتی کو سمندر کی طوفانی موجوں کے مقابلے میں لے جانے کا حوصلہ فرسا کام میرے سپرد کیا جائے گا۔ اس وقت محض ایک دھندلا سا خیال تھا کہ شاید مستقبل قریب میں ایسی کوئی صورت

پیش آجاتے۔ اس لئے میں نے تمنا کی تھی کہ اگر میرا آقا ایسا کوئی بوجھ میرے کندھوں پر رکھنے والا ہے تو اس کو سنبھالنے کی طاقت بھی عطا کرے، مجاہد کا سا ایمان دے، ایسی عزیمت دے جو مادی سہاروں سے قطعاً مستغنی ہو اور تمام سہاروں کے چھوٹ جانے پر بھی نہ ٹوٹے۔ ایسا ارادہ دے جسے کوئی طاقت اپنے مقصد کے راستے سے نہ ہٹا سکے۔

آج جب اپنے حال پر غور کرتا ہوں تو پھر ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اور بھی زیادہ لجاجت و الحاح کے ساتھ اسی دعا کا اعادہ کروں۔ اب فی الواقع وہی صورت پیش آچکی ہے۔ ساحل کے سکون و عافیت سے نکال کر سمندر کے منجدھار میں پھینک دیا گیا ہوں۔ وہی خواب تصور والی ٹوٹی ہوئی کشتی میرے حوالے کی گئی ہے جس کا تختہ تختہ الگ اور جس کے بادبان تار تار ہیں۔ سب سے بڑا مادی سہارا جس سے مدد کی توقع تھی، اقبالؒ کا سہارا تھا۔ سو وہ بھی یہاں قدم رکھتے ہی چھین لیا گیا (رحمۃ اللہ وطاب ثراہ)۔ خود اپنی طاقت کو دیکھتا ہوں تو بمنزلہ صفر کے ہے۔ دو چار جو ساتھی ملے ہیں ان کو دیکھتا ہوں تو وہ مجھ سے بھی زیادہ خستہ و درماندہ ہیں۔ اور دوسری طرف وہ حال نظر آتا ہے جس کو دیکھ کر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے عرض کیا تھا کہ رَبَّنَا اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ۔ اب سوائے خدا کے اور کوئی سہارا نہیں۔ سب مادی سہارے جھوٹے اور ناقابلِ اعتماد ہیں۔ وہی اصلی اور حقیقی سہارا ہے۔ وہی طاقت کا منبع ہے۔ وہی اسباب کا مالک اور مسبب ہے، اور وہی حامی و ناصر ہے۔ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔

(۰)

ان "اشارات" میں علامہ اقبالؒ کی وفات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن ان کے متعلق کہا صرف اتنا گیا ہے کہ وہ مودودی صاحب کے لئے "سب سے بڑا مادی سہارا" تھے۔ جس کے چھن جانے کا انہیں صدمہ تھا۔ یعنی علامہ اقبالؒ کے ساتھ مودودی صاحب کا اتنا ہی تعلق تھا کہ وہ ان کے لئے کسی مادی سہارا کا موجب تھے۔ اُن کی ذات سے اِن کا (مودودی صاحب کا) کوئی علمی یا فکری تعلق نہیں تھا جس کے نہ رہنے کا انہیں صدمہ ہو۔ اس "مادی سہارا" سے مودودی صاحب کا اشارہ غالباً دارالاسلام اور اس کی اراضیات کی طرف تھا جہاں سے انہیں الگ ہونا پڑا تھا۔ اس کی وجہ علامہ اقبالؒ کی وفات نہیں تھی، کچھ اور تھی۔ بہرحال مودودی صاحب کو علامہ اقبالؒ کی وفات سے اگر کچھ صدمہ

ہوا تھا تو صرف اس وجہ سے کہ ان کا ایک مادی سہارا ختم ہو گیا۔

علامہ اقبالؒ کی وفات ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوئی تھی۔ مکتوب نگار نے لکھا ہے کہ انہوں نے اپریل سے لے کر ۱۹۳۸ء کے آخر تک ترجمان القرآن کا پورا فائل کھنگال ڈالا ہے۔ اس میں وہ مضمون کہیں نہیں ملا جس کا ذکر مودودی صاحب نے اپنے خط میں کیا ہے۔

(ضمناً) طلوع اسلام کا پہلا پرچہ اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ وہ چھپ تو گیا تھا ۲۱ اپریل سے پہلے، لیکن شائع ہوا تھا اس کے بعد۔ چنانچہ اس کے پہلے صفحہ پر "نالۂ یتیم" کے عنوان سے، ہمارا وہ الم انگیز نوحہ چھپا تھا جسے ہم نے حضرت علامہ کی وفات پر خون کے آنسوؤں سے سپرد قرطاس کیا تھا۔ ترجمان القرآن (بابت محرم ۱۳۵۷ھ) کے جس پرچہ کے "اشارات" اوپر درج کئے گئے ہیں۔ اس سے اگلے پرچہ (بابت صفر ۱۳۵۷ھ) میں، طلوع اسلام کے مذکورہ صدر (پہلے پرچہ) پر تبصرہ شائع ہوا تھا۔ اور وہ یہ ہے۔

مجلہ طلوع اسلام پر ترجمان القرآن کا تبصرہ

ترجمان القرآن - جلد ۱۲ - عدد ۲

ماہ صفر ۱۳۵۷ھ - مطابق - اپریل ۱۹۳۸ء

طلوع اسلام - مرتبہ حکیم ذکی احمد خان صاحب - ضخامت ۸۰ صفحات -

شرح چندہ سالانہ ۵ روپے - ملنے کا پتہ:- رسالہ طلوع اسلام - دہلی۔

یہ رسالہ پہلے جناب سید نذیر نیازی صاحب کی ادارت میں نکلا تھا، مگر بعض وجوہ سے بند ہو گیا تھا۔ اب از سر نو اس کی اشاعت شروع ہوئی ہے اور اس مرتبہ ایک شخص کے بجائے، اس کی زمام ادارت ایک مستقل بیدار مغز جماعت کے ہاتھ میں ہے جو پورے عزم اور خلوص کے ساتھ میدان میں آئی ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد خود اسی کے الفاظ میں یہ ہیں۔

"پیام اقبالؒ کی نشر و اشاعت اس کا مقصد ہوگا"۔ "یہ مجلہ ملت اسلامیہ کی ہیئت اجتماعیہ کا نقیب ہوگا۔ اور اس کی ملی زندگی کے ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں پیش کرے گا"۔

اس دور میں جبکہ زندگی کے ہر شعبہ میں غیر اسلامی تصورات سرایت کر رہے ہیں، اور ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بغیر سوچے سمجھے ان سے متاثر بلکہ مسحور ہو رہا ہے، امت کی جو خدمت کی اس سے بڑی اور کوئی خدمت نہیں ہو سکتی کہ اسلامی فکر و نظر کو زیادہ سے زیادہ اصلی رنگ میں پیش کیا جائے۔ تاکہ اوہام و ظنون کی وادیوں میں بھٹکنے والے، اپنے اور غیر، سب کے سب ہر مشکل کا صحیح حل پا سکیں۔ رسالہ اپنے مقصد

میں پوری طرح کامیاب نظر آتا ہے۔ یہ اس کا پہلا نمبر ہے۔ جس کے مضامین نہایت مفید اور بلند پایہ ہیں۔ خصوصاً "دینِ فطرت" "نظریۂ قومیت کتاب وسنت کی روشنی میں" اور "کانگریس، لیگ اور مسلمان" کے عنوان سے جو سنجیدہ اور تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں بہت خوب ہیں۔ آخر میں "رفتارِ زمانہ" کے تحت سیاساتِ عالم پر ایک مجمل لیکن پُر مغز تبصرہ ہے۔

طلوعِ اسلام کے دورِ اوّل کا بھی ہم نے صمیم قلب کے ساتھ خیر مقدم کیا تھا اور اب دورِ ثانی کا بھی اسی طرح خیر مقدم کرتے ہیں۔ بلکہ اس کی حیاتِ نو ہمارے لئے پہلے سے بھی کچھ زیادہ موجب مسرت ہے۔ اس لئے کہ اب وہ ہم کو ایک ایسا رفیق سفر نظر آتا ہے جو ٹھیک اسی نصب العین کی طرف چل رہا ہے جس کی طرف ہم گامزن ہیں۔ جاہلیتِ جدیدہ کے مقابلہ میں فکرِ اسلامی کی تبلیغ کرنیوالے آج اس قدر کمیاب ہیں کہ جب تاریکی میں سے کوئی مجاہد نمودار ہوتا ہے تو ہمیں اتنی ہی خوشی ہوتی ہے جتنی کسی کال کے مارے ہوئے کسان کو آسمان پر لکہ ابر دیکھ کر ہوا کرتی ہے۔

(ترجمان القرآن ص ۱۵۲-۱۵۳)

آپ نے غور فرمایا کہ اس تبصرہ میں کہیں علامہ اقبالؒ کی وفات کے سلسلہ میں اشارہ تک نہیں کیا گیا حضرت علامہؒ کی وفات ایک عالمگیر صدمہ کا موجب تھی۔ اور اس پر ہندوستان ہی نہیں، دنیا بھر کے اخبارات و رسائل نے اداریے لکھے۔ مسلم اور غیر مسلم مفکرین نے تعزیت کے پیغامات شائع کئے۔ مہینوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن ایک تحقیق کرنے والے طالب علم کو اگر اس ضمن میں کسی کی طرف سے کچھ نہیں ملتا تو وہ مودودی صاحب ہیں جو حضرت علامہ کے ساتھ اپنے خصوصی تعلقات کے مدعی ہیں۔ اس طالب علم کی درخواست ہے کہ اگر کسی صاحب کو علامہ اقبالؒ کی وفات کے سلسلہ میں مودودی صاحب کی کسی تحریر کے متعلق کچھ معلوم ہو، تو وہ براہِ کرم انہیں (طلوعِ اسلام کی وساطت سے) مطلع کریں جس کے لئے وہ ان کے شکر گذار رہیں گے۔

(۰)

مودودی صاحب کے نزدیک علامہ اقبالؒ کا مقام

مودودی صاحب کے نزدیک، علامہ اقبالؒ کا علمی یا دینی مقام کیا تھا اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے لگ سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء کا ذکر ہے، کہ کسی صاحب نے "حدیث" کے متعلق، مودودی صاحب سے کچھ سوالات پوچھے جن کا انہوں نے 'ترجمان القرآن' کی اشاعت بابت اگست سنہ ۱۹۶۰ء میں جواب دیا۔ ان سوالات میں ایک سوال حضرت علامہ کے متعلق بھی تھا۔ وہ سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

سوال۔ اقبالؒ مرحوم کو پاکستان میں قبول عام حاصل ہے، بالخصوص جدید طبقہ میں۔ اور اسی طبقہ میں پرویزی حضرات بھی گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ لوگ مشہور کر رہے ہیں کہ اقبالؒ بھی منکرِ حدیث تھا۔ صحیح صورت حال کیا ہے۔ انگریزی خطبات میں مرحوم نے جن مآخذ کا ذکر کیا ہے ان میں حدیث کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کی تفصیل اور توضیح میں جن نکات کا مرحوم نے ذکر کیا ہے ان سے مرحوم کا اپنا نظریہ منکرین حدیث کی حوصلہ افزائی کا موجب سا بن گیا ہے۔

مودودی صاحب نے اس سوال کا جواب حسب ذیل دیا۔

جواب۔ "اقبالؒ اور حدیث" والے سوال کے بارے میں میں صرف اتنا ہی کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ ہمارے لئے اس مسئلے کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں ہے کہ حدیث کے متعلق اقبالؒ مرحوم کا نظریہ کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ اگر ہمارے پاس اس معاملہ میں صاف اور واضح نصوص اور خلفائے راشدین سے لے کر آج تک کے تمام علمائے امت کا متفقہ طرزِ عمل نہ ہوتا تو شاید ہم اس کے محتاج ہوتے کہ حدیث کے متعلق علامہ اقبالؒ کا نظریہ معلوم کرتے۔ لیکن ان حجتوں کی موجودگی میں یہ چیز تلاش کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

یہ جواب کسی تبصرہ کا محتاج نہیں بجز اس کے کہ مودودی صاحب کے برادر بزرگ محترم ابوالخیر مودودی صاحب نے نیاز (مرحوم) کو ٹھیک ہی لکھا تھا کہ "مودودی صاحب بعد از خدا بزرگ ہو سکتے ہیں"۔ ان کی نگاہوں میں کوئی اور جچتا ہی نہیں۔

(--:--)

بقیہ حقائق و عبر صلا سے مسلسل

سکتے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں اور عیسائیوں کا کوئی متحدہ محاذ بن ہی نہیں سکتا۔ اگر ہم (مسلمانوں کے) دن پھر گئے اور ہم پھر سے امتِ واحدہ کی شکل میں مجتمع ہو گئے تو ہمارا محاذ ہر اس قوم کے خلاف ہو گا جو قرآن کے معیار کے مطابق عدل و انصاف کا نظام قائم نہیں کرے گی خواہ وہ خدا پر ایمان رکھنے کی مدعی ہو یا منکر۔ ہم اس حقیقت کو محسوس کریں یا نہ کریں، یورپ اور امریکہ کی مملکتیں اس کا بخوبی احساس رکھتی ہیں اسی لئے وہ ہمیں اس فریب میں مبتلا رکھنا چاہتی ہیں کہ مسلمان اور عیسائی خدا پرستی کے اشتراک کی بنا پر ایک متحدہ محاذ بنا سکتے ہیں۔ یہ فریب ہے۔

(--:--)

حیاتِ قائدِ اعظمؒ

کے

نمایاں خط و خال

(۳)

(اس سلسلۂ زریں کی دوسری کڑی، طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ جس میں بات اس کشمکش تک پہنچی تھی جو تحریکِ پاکستان کے دوران، قائدِ اعظمؒ اور مسٹر گاندھی میں برپا تھی۔ اب اسی سلسلہ کی اگلی کڑی پیشِ خدمت ہے۔

(طلوعِ اسلام)

تحریکِ پاکستان کے پس منظر کے ان تدریجی مراحل کو پیش کرتے ہوئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مقام پر اس سلسلۂ مراسلت کے بعض نمایاں گوشے منظرِ عام پر لائیں جو انہیں ایام میں قائدِاعظمؒ اور کانگرسی رہنماؤں (گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو) کے مابین جاری تھی۔ ہمارے سامنے سب سے پہلے وہ خط آتا ہے جو گاندھی جی نے "یومِ نجات" کے مظاہروں سے متاثر ہو کر قائدِاعظمؒ کے نام لکھا۔ اس خط کے ساتھ اس نوٹ کی ایک نقل بھی منسلک تھی جو وہ اپنے اخبار "ہریجن" میں شائع کر رہے تھے۔ اور اس میں انہوں نے قائدِاعظمؒ کی یومِ نجات سے متعلقہ اپیل کو یہ معنی پہنانے کی کوشش کی تھی کہ اس سلسلے میں غیر مسلم اقلیتوں کے اشتراک سے وہ (قائدِاعظمؒ) دراصل کانگریس کے خلاف ایک محاذ قائم کرنے میں کوشاں ہیں۔ گاندھی جی، کے ۱۶ جنوری ۱۹۴۰ء کے اس مراسلہ کا جواب دیتے ہوئے قائدِاعظم نے انہیں لکھا:-

مجھے اس بات سے مسرت حاصل ہوئی کہ آخر آپ کو معلوم ہو گیا کہ "یومِ نجات" کی اہمیت اور حقیقی معنی کیا ہیں۔ یقیناً یہ درست ہے کہ بہت سے غیر کانگرسی ہندوؤں نے یومِ نجات اور ہمارے مفاد سے ہمدردی ظاہر کی ہے۔

اسی طرح جسٹس پارٹی، ہریجنوں اور پارسیوں نے بھی جو کانگرس کے مصائب کا شکار ہوئے ہیں۔ یوم نجات کی تقریب میں حصہ لیا۔ تاہم مجھے خدشہ ہے کہ آپ نے اس مظاہرہ کو غلط معنی پہنانے کی کوشش کی ہے۔ غیر مسلموں کی یوم نجات کے مظاہروں میں شرکت کی وجہ ایک حد تک یہ بھی تھی کہ مصیبت نے سب کو ایک پلیٹ فارم پہ لا کھڑا کیا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ مشترکہ مفاد نے اقلیتوں کو متحد ہونے کی ترغیب دی ہو۔

مجھے اس امر میں کبھی شبہ نہیں ہوا۔ اور میں ایک بار پھر یہ اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں نہ تو ایک قوم بستی ہے اور نہ میں اسے ایک ملک سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ ایک براعظم ہے جس میں مختلف قومیں آباد ہیں اور ان میں ہندو اور مسلمان دو بڑی اقوام ہیں۔ آج آپ بے شک اس سے انکار کریں کہ قوم مذہب کی بنا پر نہیں بنتی، لیکن ایک موقعہ پر جب آپ سے دریافت کیا گیا تھا کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ مجلسی جذبہ کی تحریک کا نتیجہ ہوتا ہے یا سیاسی اور مذہبی جذبہ کی تحریک کا تو آپ نے فرمایا تھا کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں خالص مذہبی جذبہ سے متحرک ہو کر کرتے ہیں۔

اس وضاحت کے بعد قائداعظمؒ نے گاندھی جی سے حقیقت پسندی کے نام پر یہ اپیل کی کہ:۔

مجھے امید ہے کہ معجزہ بازی کے خبط کو ترک کر کے آپ ہندوستان کو خوشی اور اطمینان کی طرف لے جانے کی جدوجہد میں اپنا مناسب پارٹ ادا کریں گے حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں۔ سیاسیات کے علمبردار کی حیثیت سے ہفتہ وار "ہری جن" میں آپ کے جو مذہبی اور فلسفیانہ مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے ہندوستان آزاد نہیں ہوگا۔ اور نہ اہمسا، ستیہ گرہ، کھدر اور چرخہ کے عجیب و غریب اصولوں سے ہندوستان کو آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ عمل اور تدبر کی مدد سے ہی ہم اس منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اب آپ سچی قومی خدمت کے بلند معیار پر پہنچنے کی کوشش فرمائیں گے اور ملکی جدوجہد میں مناسب پارٹ ادا کر کے ہندوستان کو مسرت اور اطمینان کی زندگی کی طرف لے جائیں گے۔

گلاب کا پھول اس خط کے آخری حصہ میں قائداعظمؒ کی لطافت طبع اور رفعت کردار کی ایک دلکشا جھلک بھی سامنے آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

آخر میں مجھے اس بات کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ آپ یہ جاننے کے لئے بے تاب ہیں کہ میں اپنے نام کے ساتھ کس لقب کو پسند کروں گا۔ آخر ان القابوں میں

رکھا کیا ہے؟ گلاب کے پھول کو کسی نام سے بھی پکاریئے اس کی دلآویز خوشبو میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ اس لئے میں اس معاملہ کو آپ ہی کی پسند پر چھوڑتا ہوں اور اس سلسلہ میں میری اپنی کوئی خواہش نہیں۔ یقین فرمایئے کہ میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ لقب کے معاملہ میں آپ کو میرے متعلق اس قدر تشویش کیوں لاحق ہے؟ (مسئلہ دستورِ ہند)

جواہرلال سے مکاتبت

اب ہم اس مراسلت کی طرف آتے ہیں جس کا آغاز پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنے یکم دسمبر ۱۹۳۷ء کے خط سے کیا۔ پنڈت جی نے اس خط میں قائدِ اعظم رح کو لکھا:۔

جب ہم پہلی مرتبہ دہلی میں ملے تھے تو یہ طے ہوا تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے ہمیں پھر ملنا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ بمبئی واپس پہنچ کر آپ مجھے اس سلسلہ میں ملاقات کے متعلق تحریر فرمائیں گے۔ میں اسی وقت سے آپ کے خط کا منتظر ہوں...... مسٹر سٹیفورڈ کرپس جلد ہندوستان آ رہے ہیں اور اس ملک میں دو تین ہفتے گذاریں گے، وہ ہندوستان کے راستے چین جا رہے ہیں...... اگر ممکن ہو تو اپنے اس مختصر قیام میں وہ آپ سے بھی ملنا چاہتے ہیں۔ کیا از راہ کرم آپ مجھے یہ بتا سکتے ہیں کہ آپ اس ماہ کے تیسرے ہفتے یا اس کے بعد بمبئی میں ہوں گے؛ ان معلومات کے ذریعے انہیں اپنا پروگرام متعین کرنے میں سہولت ہوگی۔ وہ بذریعہ ہوائی جہاز آ رہے ہیں اور الہ آباد میں اتریں گے۔

قائدِ اعظم رح نے ۴ دسمبر کو اپنے جوابی خط میں لکھا:۔

...... میں آئندہ دو یا تین ہفتے بمبئی میں رہوں گا۔ اگر اس دوران میں سہولت ہو تو مجھے آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوگی...... مسٹر سٹیفورڈ کرپس کے متعلق یہ ہے کہ ان کا ایک خط مجھے موصول ہوا ہے، اور میں نے ان کی ہدایت کے مطابق آپ کے پتہ پر جواب دے دیا ہے۔ لہٰذا جب وہ بمبئی آئیں گے تو ان سے ملاقات ہو جائے گی اور جب وہ مجھے لکھیں گے تو میں کوئی ایسی تاریخ مقرر کر دوں گا جو ان کے لئے موزوں ہو۔

۹ دسمبر کو پنڈت جی نے ایک اور خط لکھا، اس میں تحریر تھا:۔

دو روز ہوئے میں نے آپ کو ایک خط لکھا جس میں میں نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ میرا جلد بمبئی آنے کا ارادہ ہے۔ اور وہاں آپ سے ملنے کی امید ہے۔ کل صبح میں نے اخبارات میں آپ کا وہ بیان پڑھا جس میں آپ نے ۲۲ تاریخ اس

غرض کے لئے مقرر کی ہے کہ کانگرسی حکومتوں کا دورِ حکومت ختم ہونے پر یومِ نجات منائیں .... کل سے مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ تکلیف دی وہ یہ احساس ہے کہ ہماری زندگی کے مقاصد، قیمتوں کے اندازوں اور سیاسیات میں بہت ہی بعید فرق ہے ...... نتیجہ خیز گفتگو کے لئے یہ ضروری ہے کہ گفتگو کے لئے کوئی مشترکہ بنیاد موجود ہو۔ میرے خیال میں آپ کی طرف سے بھی اور خود اپنی طرف سے بھی مجھ پر یہ واجب ہے کہ میں اس دشواری کو آپ کے روبرو پیش کروں۔

قائداعظمؒ نے اس کے جواب، میں اپنے مکتوب میں تحریر فرمایا:۔

.... مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ گفتگو کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے لئے کوئی مشترک بنیاد اور کوئی مشترکہ مقصد ہو جس کا حصول پیشِ نظر ہو۔ اس لئے دہلی کی گفتگو میں جو گذشتہ اکتوبر میں ہوئی۔ میں نے آپ اور مسٹر گاندھی پر یہ واضح کر دیا تھا کہ اول جب تک کانگرس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ اور مختار مجلس تسلیم نہ کرے اس وقت تک ہندو مسلم سمجھوتے کی گفتگو ممکن نہیں۔ کیوں کہ عاملہ مسلم لیگ نے یہی بنیاد معین کر دی تھی۔ دوم یہ کہ اس سے قطع نظر کہ کانگرس کا وہ مطالبہ جو اس نے حکومتِ برطانیہ سے اعلان کے متعلق کیا ہے اور جو عاملہ کانگرس کے ریزولیشن میں درج ہے ...... ہم اس وقت تک اس کی تائید نہیں کر سکتے جب تک کہ اقلیت کے مسئلہ کا تصفیہ نہ ہو جائے۔

مسلم لیگ اس اعلان سے بھی مطمئن نہیں جو وائسرائے نے کیا تھا ...... اگر خوش نصیبی سے ہم ہندو مسلم مسئلہ حل کر لیتے تو ہم اس قابل ہو جاتے کہ حکومتِ برطانیہ سے مطالبۂ اعلان کے متعلق ایسا متفقہ اصول وضع کر لیں جس سے ہم مطمئن ہو سکیں۔ مسٹر گاندھی اور آپ نے دہلی میں نہ تو میری پہلی تجویز منظور کی اور نہ دوسری۔ مگر آپ نے ازراہِ کرم مجھ سے دوبارہ ملنے کی خواہش ظاہر کی میں نے کہا کہ میں آپ سے مل کر ہمیشہ خوش ہوں گا۔......

قائداعظمؒ نے مذکورہ بالا خط ۱۳ ستمبر کو لکھا۔ پنڈت جی ان دنوں بمبئی میں ہی تشریف فرما تھے۔ اور یہ خط انہیں بمبئی کے پتہ پر ہی موصول ہوا۔ اب ہم ان کے اس جوابی مکتوب کی طرف آتے ہیں، جو انھوں نے ۱۴ دسمبر کو اپنی بمبئی کی قیام گاہ سے قائداعظمؒ کے نام تحریر فرمایا۔ اس خط میں پنڈت جی لکھتے ہیں:۔

.... اپنے خط میں آپ نے دو ایسی ابتدائی شرائط پر زور دیا ہے جو اس سے قبل کہ کوئی مشترکہ بنیاد پیدا ہو پوری ہونی چاہئیں ...... کانگرس نے ہمیشہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نہایت اہم اور بااثر انجمن سمجھا ہے اور ہم اسی وجہ سے

اس کے متمنی ہیں کہ ہمارے درمیان جو اختلافات ہیں وہ رفع ہو جائیں۔

لیکن لہٰذا جو کچھ آپ تجویز فرما رہے ہیں۔ وہ اس سے کوئی زیادہ بڑی بات ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم کسی قسم کا انکاری اعلان کریں اور ان مسلمانوں سے برأت اور علیحدگی اختیار کر لیں جو لیگ میں نہیں ہیں ...... یہ ممکن نہیں کہ ہم ان سے برأت اختیار کر لیں یا انہیں اپنے سے الگ کر دیں... اگر آپ کی یہ خواہش ہے کہ لیگ کو ایسی جماعت تسلیم کیا جائے جو تمام مسلمانوں کی واحد نمائندہ ہے تو ہم اُسے تسلیم کرنے سے قطعی طور پر قاصر ہیں...... آپ نے دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ مسلم لیگ کانگرس کے اس مطالبہ کی تائید نہیں کر سکتی جو اس نے برطانیہ سے اعلان مقاصد کے لئے کیا ہے..... اگر مسلم لیگ اس سے متفق نہیں ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے سیاسی مقاصد بالکل مختلف ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کانگرس اس (مطالبہ) کو کس طرح چھوڑ سکتی ہے یا بدل سکتی ہے؛ میں ذاتی طور پر اس کوشش کی مخالفت کروں گا جو اس کے بدلنے کے لئے ہو۔

قائدِ اعظمؒ نے پنڈت جی کے اس طویل خط کے جواب میں ۱۵ر دسمبر کو ایک مختصر لیکن جامع جواب ارسال فرمایا اور اس میں واضح کیا کہ:-

...... مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دوسری بات کے متعلق آپ میرے مفہوم کو سمجھ نہیں سکے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ مسلم لیگ کانگرس کے اس مطالبہ کی تائید نہیں کر سکتی جو اس نے اعلانِ مقاصد کے متعلق برطانیہ سے کیا ہے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کانگرس کے اس مطالبہ کی تائید اس صورت میں نہیں کر سکتے جس صورت میں وہ عاملہ کانگرس کے ریزولیوشن میں درج ہے...... اور اس کے وجوہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔

اگر کانگرس اس ریزولیوشن میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں کر سکتی اور جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ آپ ذاتی طور پر اس تبدیلی کی ہر کوشش کی مخالفت کریں گے اور پھر جیسا کہ آپ نے واضح فرمایا ہے کہ آپ یہ بالکل نہیں کر سکتے کہ مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی واحد اور مختار نمائندہ جماعت تسلیم کریں تو پھر ان حالات میں آپ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں اور کیا چاہتے ہیں کہ میں کروں؟

اب ہمارے سامنے پنڈت جی کا ۱۶ر دسمبر کا وہ خط آتا ہے جو اس سلسلہ مراسلت کی آخری کڑی ہے۔ کیونکہ سابقہ مراسلت اور اس خط کے مندرجات کی روشنی میں قائدِ اعظمؒ نے اس کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ پنڈت جی کے اس خط میں ۱۴ر دسمبر کے خط میں اختیار کردہ موقف کی تکرار

کے سوا اور کوئی روشنی نظر نہیں آئے گی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

..... میں اس فرق کو سمجھا جو آپ نے واضح فرمایا۔ بے شک مسلم لیگ کسی اعلان کے عیال کی مخالفت نہیں کر سکتی ..... جنگ کے متعلق کانگرس نے گذشتہ گیارہ ماہ میں اپنی پالیسی کا بار بار اعلان کیا ہے۔ موجودہ اعلان اس پالیسی کا منطقی نتیجہ ہے ..... اس کی تفصیلات پر غور کیا جا سکتا ہے اور ان پر بحث ہو سکتی ہے۔ باہمی تعاون سے یہ طے ہو سکتا ہے کہ ان پر عمل کیونکر ہو۔ بالخصوص اقلیتوں اور دوسرے گروہوں کے مفاد پر احتیاط سے غور کیا جانا چاہیئے، اور ان کا تحفظ ہونا چاہیئے۔ لیکن اعلان کی اصل بنیاد پر ہی اعتراض کے معنی یہ ہیں کہ سیاسی تخیل اور پالیسی میں عظیم اختلاف موجود ہے۔

کیا میں پھر یہ عرض کر سکتا ہوں کہ ہم میں سے کوئی بھی مسلم لیگ کے اقتدار و اہمیت سے نہ انکار کرتا ہے اور نہ اس کو گھٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اسی وجہ سے ہے کہ ہم اس کے متمنی ہیں کہ اس سے ملکی معاملات پر گفتگو کریں۔ اور ان دشوار مسائل کا قابلِ اطمینان حل تلاش کریں جو ہمارے سامنے ہیں ..... میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ حقیقی دشواری یہ ہے کہ سیاسی تصور اور سیاسی مقاصد میں اختلاف ہے۔

اس وقت ۲۲ر دسمبر کے آل انڈیا مظاہرے (یومِ نجات) نے ایک جذباتی رو پیدا کر دی ہے جو پوری قوت کے ساتھ باہمی ملاقات اور بحث میں مانع ہے۔ مجھے اس کا شدید افسوس ہے اور دل سے یہ خواہش رکھتا ہوں کہ آپ اس رکاوٹ کو دور کریں جو ناراضگی کی طرف لئے جا رہی ہے۔ مجھے اب بھی امید ہے کہ آپ ایسا کر سکتے ہیں ..... میں بہت ہی گہرے سیاسی عقائد رکھتا ہوں اور میں نے ان کے مطابق سالہا سال جدوجہد کی ہے۔ میں ان کو کبھی چھوڑ نہیں سکتا۔ خصوصاً اس وقت جبکہ دنیا شدید اور ہولناک خطرہ میں مبتلا ہے۔

اس خط کے محولہ بالا مندرجات کا جائزہ لیجئے بالخصوص آخری حصہ کا۔ اور پھر سوچئے کہ قائدِاعظمؒ اس کا کیا جواب دیتے؟ قائدِاعظمؒ کی دور بین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ دس کروڑ مسلمانوں کی قوتِ تنظیم اور عزمِ صمیم کے سامنے ایک دن یہ خودسری کی چوٹیاں خم ہو کر رہیں گی۔ چنانچہ ان کی خاموشی کا مخصوص اور پُروقار انداز ہی اس خط کا موزوں ترین جواب تھا اور حالات نے بتا دیا کہ کانگرس کو بالآخر وہی مقام قبول کرنا پڑا جو قائدِاعظمؒ نے اپنے آخری خط میں اس کے لئے تجویز کیا تھا۔

وائسرائے ہند سے خط و کتابت

اس مرحلہ پر اس خط و کتابت کا ذکر بھی تحصیل حاصل ہوگا جو قائدِ اعظمؒ اور وائسرائے ہند لارڈ لن لتھگو کے مابین انہی ایام میں جاری تھی۔ اس کا آغاز قائدِ اعظمؒ کے ۵ر نومبر ۱۹۳۹ء کے پہلے مکتوب سے ہوا۔ جس میں انہوں نے وائسرائے سے اپنے مذاکرات کی روشنی میں چند ضروری مطالبات کیے تھے۔ ان مطالبات میں اعراب فلسطین کے مطالبات کی تکمیل اور ہندوستانی فوجوں کو اسلامی ممالک کے خلاف استعمال نہ کرنے کی یقین دہانی طلب کی گئی تھی۔ اور ساتھ ہی زمانہ جنگ پر ہندوستان کے دستوری مسائل کا ازسرِ نو جائزہ لینے کا مطالبہ شامل تھا۔ لیکن اس مکتوب میں ان کا اہم ترین مطالبہ یہ تھا کہ:۔

> ملک معظم کی حکومت یا پارلیمنٹ کی طرف سے ہندوستان کی دو بڑی قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری کے بغیر اصولاً یا کسی جزئی طریق سے نہ تو کوئی اعلان کیا جائے گا اور نہ کوئی دستور بصورتِ قانون منظور کیا جائے گا۔

اس دوران میں مراسلت کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن وائسرائے کی طرف سے قطعی اور آخری جواب اس وقت موصول ہوا جب انہوں نے ملک معظم کی حکومت سے ان امور کے متعلق بالتفصیل مشورہ کر لیا۔ برطانوی حکومت سے اس مشاورت کی تکمیل کے بعد انہوں نے ۱۳ر دسمبر کو قائدِ اعظم کے نام جو خط لکھا، اس میں جہاں دیگر مطالبات کے بارے میں انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی وہاں مذکورہ اہم ترین مطالبہ کے متعلق انہیں بتایا گیا کہ:۔

> میں آپ کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ ملک معظم کی حکومت کو اس معاملہ میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے کہ ہندوستان کے آئینی استحکام اور ترقی کے لئے آپ کی قوم کا مطمئن ہونا کس قدر ضروری ہے۔ بنا بریں آپ کو اس معاملہ میں کسی اندیشہ کی ضرورت نہیں کہ اپنی حیثیت کی وجہ سے ہندوستان میں آپ کی ملت کی رائے کو جو وزن حاصل ہے اسے گھٹایا جائے گا۔

منزل کی نشان دہی

کانگرس اور حکومت کے مقتدر نمائندوں سے قائدِ اعظمؒ کے اس سلسلۂ مراسلت کے ساتھ ہی جس کی تفصیل سطورِ بالا میں پیش کی گئی ہے۔ ہمارے سامنے ان کا وہ اہم بیان آتا ہے جو انہوں نے انگلستان کے مشہور اخبار ڈیلی میل (DAILY MAIL) کے نمائندے کو دیا۔ اس بیان میں انہوں نے فرمایا:۔

> مسٹر گاندھی درحقیقت حکومت برطانیہ سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ کانگرس کی درخواست پر بقیہ ملک کے سر ایسا انتظام حکومت منڈھ دے جو کانگرس پارٹی نے معین کیا ہو۔ اگر مسٹر گاندھی حقیقی راہِ عمل اختیار کرنا چاہتے ہیں تو وہ کیوں

یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ برطانیہ فوراً اپنی ذلّت آفریں سنگینیں، ہندوستان سے ہٹا لے تاکہ ہندوستانی عوام مکمل آزادی اور خود مختاری کے ساتھ اپنے حقِ خود اختیاری کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کر سکیں۔ لیکن مسٹر گاندھی حکومتِ برطانیہ سے ایسا مطالبہ نہیں کریں گے۔ کیونکہ انہیں بخوبی علم ہے کہ اگر ان حالات میں کانگرسی پارٹی نے اپنا موجودہ نصب العین جمہورِ ہند کے سر منڈھنے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

بعض حلقوں میں مسلم لیگ پر بے بنیاد الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ وہ موانع اور رکاوٹیں پیدا کر رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ انگلستان میں مسلم لیگ کے خلاف انتہائی غلط پروپیگنڈا کیا گیا ہے۔ مسلم لیگ کے طرزِ عمل کے متعلق یہ پروپیگنڈا قطعاً جھوٹ پر مبنی ہے — مسلم لیگ نے ایک مثبت مطالبہ کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شد و مد سے باتیں کرنے کے بجائے ہم ہر وقت ٹھوس تجاویز پیش کرنے پر آمادہ رہے ہیں۔ لیکن اب تک وائسرائے یا ملکِ معظم کی حکومت نے ایسی خواہش کا اشارہ تک نہیں کیا۔

اس بیان کے آخر میں قائدِ اعظمؒ نے کانگرس اور برطانیہ دونوں کو یہ کہتے ہوئے پوری طرح خبردار کیا کہ:

مجھے بتا دینا چاہیئے کہ اب ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ اسلامی ہندوستان اپنے مستقبل یا اس ملک کے دستور کی تشکیل میں اپنے حقوق کو مسٹر گاندھی کے مفروضہ ٹریبونل یا کسی اور طرز کے ادارے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑے گا۔ نہ اسلامیانِ ہند اس پر تیار ہیں کہ حکومتِ برطانیہ کے آخری فیصلہ کو قبول کر لیں۔ ہمارے لئے کیا کچھ بہترین ثابت ہو سکے گا۔ اس کا قطعی اور آخری فیصلہ خود اسلامیانِ ہند کی منشا پر موقوف ہے اور وہی اس کے آخری جج ہوں گے۔

(مسئلہ دستورِ ہند)

آؤ تیاری کریں

اس بیان کے جلد بعد قائدِ اعظمؒ کو مولانا شوکت علی مرحوم کی ایک یادگار کی نقاب کشائی کی تقریب میں شرکت فرمانے کا موقع ملا۔ ان سے قبل مولانا ظفر علی خان ایک دھواں دھار اور ہنگامہ خیز تقریر کر چکے تھے۔ چنانچہ جب قائدِ اعظمؒ خطاب کے لئے کھڑے ہوئے تو انہوں نے اس ہنگامی اور جذباتی تقریر کی روشنی میں حاضرین کے جذبات و احساسات کا رخ واقعات اور حقائق کی طرف پھیر دیا اور واضح کیا کہ جذبات کے دھارے پر بہنے کے بجائے اسلامیانِ ہند کو حقیقت پسندی سے سیاسیاتِ ہند میں اپنے مقام کو سمجھنا چاہیئے۔ انہوں نے حقیقتِ حال واضح کرتے ہوئے فرمایا:۔

مالی حیثیت سے ہم دیوالیے ہیں۔ اقتصادی لحاظ سے صفر اور تعلیمی نقطۂ نظر سے پست ترین سطح پر کھڑے ہیں۔ اس لئے میں انتہائی سنجیدگی سے کہوں گا کہ اگر آپ اپنا حقیقی مقام و منصب حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے آپ کو مسلح کیجئے اور اپنے اندر ضروری صلاحیتیں پیدا کیجئے۔ اس قسم کی گفتگو سے کوئی فائدہ نہیں کہ مسلمانوں نے صدیوں تک اس ملک پر حکومت کی ہے اور اب بھی ان کو حکومت کرنے کا حق ہے۔ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ محنت کرو اور استقلال سے اپنی جد و جہد جاری رکھو۔ ذمہ داری اور فرض شناسی کا احساس پیدا کیجئے۔

اس کے بعد انہوں نے سیاسی صورتِ حال کا یوں تجزیہ فرمایا۔

برطانیہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کا مدعی ہے۔ دوسری طرف مسٹر گاندھی ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم الگ الگ پسند لوگ ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ان میں سے کسی کو نہ تو الگ الگ اور نہ مجموعی طور پر یہ اجازت دیں گے کہ ہم پر حکومت کرے۔ دنیا جان چکی ہے اور برطانوی حکومت نے اپنی دور اندیشی سے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ مسلم لیگ اور صرف مسلم لیگ اسلامی ہند کی واحد نمائندہ اور با اختیار مجلس ہے۔ لیکن اگر کہیں روشنی طلوع نہیں ہوئی تو صرف شیوگاؤں میں ۔۔۔ مسٹر گاندھی ابھی تک اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں۔

انہوں نے ایک حقیقت پسند سالارِ اعظم کی حیثیت سے اپنے ساز و یراق کی تفصیل بھی اپنے سپاہیوں کے سامنے واضح کر دی اور کہا۔

اورنگ زیب روڈ پر میری نجی قیام گاہ کو شاید قابلِ رشک سمجھا جائے مگر۔۔۔ سیکرٹریٹ کہاں ہے اور فوج کہاں۔ میرا تمام اسلحہ خانہ صرف اس قدر ہے ۔۔۔ ایک اٹاچی کیس۔ ایک ٹائپ رائٹر اور ایک پرسنل اسسٹنٹ۔

اور اس کے ساتھ ہی ایک اٹل حقیقت کا یوں اظہار فرمایا۔

اگرچہ میں نے یہ بات صاف اور واشگاف طور پر بیان کر دی، مگر میں شکست تسلیم کرنے کا بھی قائل نہیں۔ مجھے اپنی قوم پر پورا اعتماد ہے۔ مگر میں اس کے خلاف ہوں کہ اپنی مشکلات کو کم کر کے دکھایا جائے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود جو ہماری راہ میں حائل ہیں، میرا اب بھی یقین ہے کہ مسلمان ہر دوسری قوم سے بہتر سیاسی دماغ رکھتے ہیں۔ سیاسی ذکاوت ان کے خون میں رچی ہوئی ہے۔ اسلام کی حرارت ان کے رگ و پے میں دوڑ رہی ہے۔ جب میں

نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے فیصلے چند آدمیوں کے فیصلے نہیں بلکہ یہ پوری قوم کی آواز ہیں، تو میں خوشی خوشی پیش قدمی کا حکم دوں گا۔ اگر ایسی صورت سامنے آئی تو میں خود سب سے پہلے سینہ پر گولی کھانے کے لئے آگے بڑھوں گا۔ اس سے قبل کہ میں آگے بڑھنے کا حکم دوں، میں یہ یقین حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ دشمنوں پر فتح پانے کے معقول امکانات موجود ہیں۔

قائداعظمؒ کی اس تقریر کا ایک ایک لفظ جنگ کی تیاری کا بگل تھا۔ وہ اپنی ملّت کو صورتِ حال کے تمام گوشوں سے آگاہ فرما رہے تھے۔ اور گرد و پیش کا نقشہ پوری تفصیل سے ان کے سامنے لا رہے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے یہ تفصیل بھی پیش کی کہ:

(گذشتہ) ستمبر تک انگلستان ہٹلر کے مقابلہ کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس لئے آسٹریا اور چیکو سلاویکیا کو قربان کرنا پڑا۔ مسٹر چیمبرلین کو ہٹلر کی خوشامد کے لئے میونخ جانا پڑا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس وقت برطانیہ ایک طاقتور سلطنت نہیں تھی؟ کیا اس وقت برطانوی بیڑہ اور فوج طاقتور نہیں تھے؟ مسٹر چیمبرلین نے اس وقت جنگ سے جان کیوں بچائی؟ وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے اس وقت یہ محسوس کیا کہ وہ پوری طرح تیار نہیں۔ اسی طرح جب مجھے یہ یقین ہو جائے گا کہ مسلمان جنگ کے لئے تیار ہیں تو میں بلاتامل انہیں آگے بڑھنے کا حکم دوں گا اور جو کوئی اس وقت غداری کرے گا وہ اس کا سزاوار ہوگا کہ اُسے گولی مار دی جائے۔ مہاتما گاندھی بھی باوجود اپنی اس قدر طاقتور تنظیم، غیر محدود وسائل اور پریس کی تائید کے سول نافرمانی کے لئے برابر پس و پیش کر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے کہ وہ تیار نہیں۔ اور تیاری کر رہے ہیں مسلمانوں سے میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ ــــ آؤ ہم بھی تیار ہو جائیں ــــ

تیاری کا بگل بج چکا تھا۔ قوم کے محبوب قائد نے تیاری کے لئے ملک گیر اپیل کر دی تھی اور اب ملّت ایک اہم اور تاریخی جد و جہد کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ اس دوران میں عالمہ مسلم لیگ فیصلوں کی توثیق کے لئے ۲۵ فروری ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس منعقد ہوا۔ کونسل کے اس اہم اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے سب سے پہلے قائداعظمؒ نے مجلس عالمہ کے فیصلوں کا پس منظر پیش کیا اور ان مطالبات کی تفصیل بیان کی جو جنگِ عظیم سے پیدا شدہ صورتِ حال کی روشنی میں حکومت کے سامنے لائے گئے۔

لیگ کونسل سے خطاب

مسلمانوں کی واحد نمائندہ اور بااختیار جماعت کی حیثیت سے مسلم لیگ کے متعلق مجلسِ عالمہ کی قرار داد کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:-

ایک اور مطالبہ یہ تھا کہ عبوری دور کے لئے کسی پارٹی کے دباؤ یا دھمکی سے مرعوب ہو کر، خواہ وہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو، نہ تو مسلم لیگ کی رضامندی حاصل کئے بغیر کوئی سمجھوتہ کیا جائے گا اور نہ مسلم لیگ کسی اعلان یا آئین کو قانونی صورت دینے سے اتفاق کرے گی، تا آنکہ اس کی منظوری نہ لی جائے۔

اس معاملہ میں وائسرائے نے پورا اطمینان دلایا ہے کہ وہ مسلمانوں کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کر رہے ہیں اور کسی ایسے سمجھوتے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا جس میں مسلمانوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ یہ بیان ناقابلِ اطمینان ہے۔ اس نے مسلمانوں کو صرف صلاح و مشورہ کی منزل عطا کی ہے اور مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ان کے مستقبل کا فیصلہ ان کے اپنے ہاتھوں میں ہو۔

کانگرسی وزارتوں نے اپنے زیرِ اقتدار صوبوں میں مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے ان کی تحقیقات کے سلسلے میں کانگرس نے سرموریس گائر (چیف جسٹس آف انڈیا) کی صدارت میں ایک جوڈیشل عدالت قائم کرنے کی پیش کش کی تھی۔ قائدِ اعظمؒ نے بدلائل اس تجویز کو لغو قرار دیا اور اس پر آمادگی ظاہر کی کہ اس کے لئے ایک رائل کمیشن مقرر ہو۔ جس میں انگلستان کے ہائی کورٹ کے دو جج شامل ہوں اور اس کی صدارت پریوی کونسل کا کوئی لارڈ کرے۔ لیگ کونسل میں تقریر کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے مجلسِ عاملہ کے اس مطالبہ کی بھی وضاحت کی اور پھر فرمایا:۔

عدالت ایسی ہی ہو سکتی ہے جو ملک کے زہریلے ماحول سے بالاتر ہو، اور گواہوں کے بیانات اور حلف لینے، اور ہر قسم کے وہ کاغذات طلب کرنے کے اختیارات سے مسلح ہو جن کی انصاف کرنے کے لئے ضرورت ہو۔ مگر کانگرس نے اس تجویز کا یہ کہہ کر مضحکہ اڑایا کہ ہم اپنے خانگی امور میں غیر ملک سے امداد طلب کر رہے ہیں۔ گویا سرموریس گائر جن کا نام کانگرس نے تجویز کیا ہے۔ وہ بالکل سودیشی ہیں اور وارھایا شبوگاؤں میں پیدا ہوئے ہیں۔

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

قائدِ اعظمؒ نے لیگ کونسل میں اپنے اس خطاب کا اختتام ملتِ اسلامیہ کے واحد نمائندہ زعیم کے پروقار انداز سے کیا۔ اس میں دشمنوں کے لئے ایک زوردار انتباہ بھی تھا اور اپنوں کے لئے ایک مؤثر اور عمل براندار اپیل بھی۔ انہوں نے خاتمۂ کلام پر فرمایا۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ ہمارا مطمحِ نظر کیا ہے؟ اگر تم اب بھی یہ نہیں سمجھتے ہو کہ ہمارا مطمحِ نظر کیا ہے، تو تم کبھی نہیں سمجھو گے۔ یہ تمام مسئلہ بڑا سادہ ہے۔ برطانیہ عظمیٰ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتی ہے۔ مسٹر گاندھی، اور ان کی کانگرس بھی ہندوستان کے حکمران بننا چاہتے ہیں۔ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ

> ہم نہ تو برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے، اور نہ مسٹر گاندھی اور کانگرس کو۔ ہم اپنے لئے آزادی اور خود مختاری کے طالب ہیں۔ میں مسلمانوں سے یہ کہتا ہوں کہ اس مقصدِ عظیم کے لئے اپنے آپ کو منظم کرو اور مسلم لیگ کا یہ پیغام ہر مسلمان تک پہنچا دو۔

قافلہ سالار نے تیاری کا بگل بجا دیا اور کاروانِ ملت ذوقِ سفر کے نئے ولولوں سے سرشار ہو کر سامانِ سفر باندھنے لگا۔ زندگی کی ایک عظیم ترین منزل اب اس کے قدم لینے کو آگے بڑھتی ہے۔ اس منزل مراد سے آزادی اور استقلال کی انقلاب آفریں کامرانیاں اور فائز المرانیاں وابستہ ہیں۔ اور ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مقام پر کچھ دیر کے لئے رُک جائیں ——ہماری تاریخ کا یہ ایک انتہائی مبارک اور کامیاب سفر ہے اور قوموں کی زندگی میں ایسے انوکھے سفر جو خوش نصیبوں کے آئینہ دار اور سرمایۂ نازش و افتخار ہوں۔ بار بار درپیش نہیں ہوتے۔ ہم نے ان صفحات میں تحریکِ پاکستان کا پس منظر پیش کرتے ہوئے عظیم قافلہ سالار کے اس حسنِ تدبر کی تصویر پیش کی ہے جو اپنے کاروانِ شوق کو دشمنوں کی یلغار سے بچاتا اور کٹھن راہوں کے نشیب و فراز کو پاٹتے استقلال سے روندتا اس حسین منزل کے آغاز تک لے آیا۔ بظاہر یہ تین سال کی مختصر مدت کا سفر تھا۔ لیکن اس تھوڑی سی مدت میں ہم جو راہ طے کر آئے وہ کالے کوسوں کی راہ تھی۔ آغازِ سفر مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں کے حصار میں تھا۔ صوبجاتی خود مختاری کے سائے میں ہمارے دشمن اقتدار سے مسلح ہو کر نہ صرف آگے بڑھ آئے تھے، بلکہ ہمارے ذوقِ سفر کو شکست دینے کے لئے انہوں تابڑ توڑ حملے بھی شروع کر دیئے تھے۔ لیکن قافلہ سالار کی آواز بجلی کا وہ کڑکا بن کر فضائے سیاست میں مرتعش ہوئی جس نے حریفوں کے اوسان خطا کر دیئے۔ اُن کی فتحمندیوں کی بساط اُلٹ کر رہ گئی۔ اور ان کے حربوں کو ناکام بنا دیا گیا۔

یہ ہے ہمارا تین سال کا کامیاب سفر جسے کامرانیوں کے اعتبار سے ایک صدی کی منزل تک پھیلایا جا سکتا ہے۔ یہ ہے تحریکِ پاکستان کا وہ پس منظر جس کی پہنائیوں میں ہماری نشاۃ ثانیہ کی حیات آفریں داستانیں کروٹ لے رہی تھیں۔ اسی کا اتمام اب تحریکِ پاکستان کا حرفِ آغاز بنتا ہے۔ اسی اذانِ سحر سے آزادی و استقلال کی صبح بہار دامنِ شب سے مسکراتی ہوئی منظرِ عام پر آئے گی۔

محمد علی جناح! ملتِ اسلامیہ کے قائدِ اعظمؒ!! تم پر ملت کا سلام ہو کہ تمہاری نادرِ روزگار قیادت نے اس چومکھی جنگ کو قابلِ رشک فراست اور بلند حوصلگی سے لڑا، اور اپنی ملتِ عزیز کو نئے عزائم اور نئے ولولوں سے مسلح کر کے اس کا رخ آزادی اور استقلال کی منزلِ مقصود کی طرف پھیر دیا۔

طلوعِ اسلام کی آئندہ اشاعت تحریکِ استقلالِ پاکستان کی انہی للّٰہ الحمد فتح مندیوں کی تفصیل پیش کرے گی ؎

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ چار سو و رنگ و بو
ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
حاکمیت کا بتِ سنگین دل و آئینہ رُو

(اقبالؒ)

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

شاعر نے ایک خواب دیکھا۔

دامنِ کوہ کی پُرسکوت فضا میں، صاف و شفاف ندی کے کنارے، تا حدِ نگاہ سبزہ زار، رنگا رنگ پھولوں کی شگفتہ و شاداب روشیں، قسم قسم کے پھلوں سے لدے ہوئے درخت، لہلہاتے کھیت، شہروں کے شور و شغب سے دور، اس سکون افزا ماحول میں:

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں — چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں — ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ — پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی — جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی مؤذن — میں اس کا ہمنوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے — تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

(بانگ درا)

اس ماحول میں مسجد ہو، کتب خانہ ہو، دارالمطالعہ ہو، رہائش گاہیں ہوں، مہمان خانہ ہو، دارالاقامہ (ہوسٹل) ہو، اس بستی میں دنیائے اسلام کے ممتاز اہلِ علم و تحقیق، مختلف موضوعات پر ریسرچ میں مصروف ہوں، مذاکروں کا اہتمام ہو، خطبات کا انصرام ہو۔ طلباء تعطیلات گذارنے وہاں آئیں اور اس علمی فضا سے بہرہ یاب ہوں۔

یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو

شاعر کے ایک عقیدت مند نے جس کا سینہ اسلام کے درد سے لبریز، اور جس کا قلب قرآن کے عشق سے معمور تھا، یہ خواب سنا اور چپکے سے اُٹھ کر چلا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ واپس آیا اور کہا کہ آپ کے خواب نے محسوس تعبیر کی شکل اختیار کر لی ہے۔ تشریف لے چلئے اور اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔

یہ خواب تھا علامہ اقبالؒ کا اور اسے محسوس پیکر میں ڈھالنے والے تھے (خان صاحب) چوہدری نیاز علی خان۔ امرتسر سے جو سڑک پٹھان کوٹ کو جاتی ہے اس پر پٹھان کوٹ سے ایک اسٹیشن ورے سرنا کے پاس سے

نہر باری دوآب گزرتی ہے جو اپنے منبع کے قریب ہونے کی وجہ سے اچھا خاصا دریا ہے۔ سر پر ہمالیہ پہاڑ سایہ فگن ہے۔ وہ علاقہ شہروں کے شور و شغب سے دور بھی ہے اور اس میں شہروں کی سہولتیں۔ سڑک، ریل، تار، ڈاک خانہ سب میسر بھی۔ چوہدری صاحب نے اس سرزمین پر وہ تمام عمارات تعمیر کر دیں جن کا تصور شاعر کی آنکھ نے پیش کیا تھا۔ قریب ستر ایکڑ مزروعہ اراضی اس کے لئے وقف کر دی اور اس میں قریب پچیس ایکڑ رقبہ میں پھل دار درختوں کا باغ لگا دیا۔ اور اس کا نام دارالاسلام رکھا گیا۔ حضرت علامہؒ کے ذہن میں اس سکیم کا مقصد کیا تھا اس کا اندازہ اس مکتوبِ گرامی سے لگ سکتا ہے جو انہوں نے (اس زمانے کے) جامعہ ازہر (مصر) کے ریکٹر، شیخ مصطفیٰ المراغی کی خدمت میں ارسال فرمایا تھا۔ اس میں آپ نے لکھا تھا:-

> ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایک ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں قائم نہیں کیا گیا۔ ہماری خواہش ہے کہ اس ادارہ کو وہ شان حاصل ہو جو دوسرے دینی اور اسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کر ہو۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علومِ جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور چند علومِ دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجہ کی ذہنی صلاحیتیں موجود ہوں اور وہ اپنی زندگیاں دینِ اسلام کی خدمت کے لئے وقف کرنے کو تیار ہوں۔ ہم ان کے لئے تہذیبِ حاضرہ کے شور و شغب سے دور ایک کونے میں ہوسٹل بنانا چاہتے ہیں جو کہ ان کے لئے ایک علمی اسلامی مرکز ہو۔ اور ہم ان کے لئے ایک لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر قسم کی نئی اور پرانی کتب موجود ہوں۔ علاوہ ازیں ہم ایک ایسا رہنما جو کامل اور صالح ہو اور قرآنِ حکیم میں بصیرتِ تامہ رکھتا ہو اور نیز انقلابِ دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو، مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی روح سے واقف کرے اور تفکرِ اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت (اقتصادیات) اور سیاسیات کے علوم میں ان کی مدد کرے۔ تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کر سکیں۔
>
> اس تجویز کی اہمیت آپ پر منکشف کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ خود اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا میری تمنا ہے کہ آپ ازراہِ عنایت ایک مصری عالم، روشن خیال کو جامع ازہر کے خرچ پر ہمارے پاس بھیج کر ممنون فرمائیں۔ تاکہ یہ شخص ہم کو اس کام میں مدد دے۔ چاہیئے کہ یہ شخص علومِ شرعیہ اور تاریخ تمدنِ اسلامی میں ماہر ہو۔ نیز زبانِ انگریزی پر بھی قدرتِ کامل رکھتا ہو۔ علاوہ ازیں مجھے مصری وفد کے اراکین سے جنہوں نے پچھلے دنوں ہمیں اپنی زیارت سے

مشرف فرمایا تھا معلوم ہوا تھا کہ جامع ازہر اپنے خرچ پر ہندوستان میں اپنے چند مبلغین مختلف مقامات میں بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ ایک مرکز اسلامی کی بنا جیسا کہ میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے، مقصدِ تبلیغ کے لئے، مختلف مقامات پر مختلف مبلغین بھیجنے سے زیادہ اولیٰ و اقرب ہے مجھے توقع ہے کہ دینِ حق کا نور اس مرکز سے ہندوستان کے تمام اطراف و اکناف میں پھیلے گا۔ اگر آپ میرے ساتھ اس لائحہ عمل پر اتفاق کریں تو آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔ اپنے خیال سے جلد از جلد مطلع فرمائیں۔

(بحوالہ طلوع اسلام - بابت اگست ۱۹۳۹ء)

شیخ المراغی نے اس مکتوب کے جواب میں معذرت لکھ بھیجی کہ سردست ان صفات کا کوئی عالم ہندوستان نہیں بھیجا جا سکتا۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف اہل الرائے حضرات سے اس اسکیم کی عملی تشکیل کے متعلق استصواب کیا گیا۔ حضرت علامہؒ ان دنوں علیل تھے طے یہ پایا کہ اس اسکیم کی مبادیات کی دیکھ بھال کے لئے کوئی موزوں آدمی مقرر کر لیا جائے۔ ان دنوں، سید ابوالاعلیٰ مودودی حیدر آباد (دکن) سے ماہنامہ ترجمان القرآن نکالتے تھے لیکن حالات نامساعد تھے جن کی وجہ سے وہ وہاں بڑی عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ترجمان القرآن میں، نظریہ قومیت اور اسلامی مملکت سے متعلق مودودی صاحب کے کچھ مضامین شائع ہوئے جو علامہ اقبالؒ کے نظریات سے ہم آہنگ تھے۔ پروفیسر صاحب کے مودودی صاحب سے بھی مراسم تھے اور چوہدری نیاز علی خان صاحب سے گہرے قلبی تعلقات۔ ان کے مشورہ اور حضرت علامہؒ کی تصویب سے یہ طے پایا کہ اس کام کے لئے مودودی صاحب کو بلا لیا جائے۔ چنانچہ وہ دارالاسلام تشریف لے گئے اور ابتدائی کام شروع کر دیا گیا۔ حضرت علامہؒ کا ارادہ تھا کہ انہیں مرض سے کچھ افاقہ ہو جائے تو وہ بہ نفسِ نفیس دارالاسلام منتقل ہو جائیں گے اور اس کے بعد پوری اسکیم روبہ عمل آنی شروع ہو جائے گی۔

ادھر یہ تصورات، وابستگانِ دارالاسلام کے لئے فردوسِ نظر بن رہے تھے اور ادھر کارکنانِ قضا و قدر مسکرا رہے تھے کہ کل کے علم سے بے خبر انسان کس طرح تمناؤں کے کھلونوں سے جی بہلاتا رہتا ہے۔ ابھی اس اسکیم کا پورا نقشہ بھی مرتب نہ ہونے پایا تھا کہ حضرت علامہؒ دنیا سے تشریف لے گئے اور دارالاسلام ایک جسدِ بے روح بن کر رہ گیا۔ مودودی صاحب کے سلسلہ میں وہاں بعض ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی یاد کے ساتھ بہت سی تلخیاں وابستہ ہیں۔ اور چونکہ چوہدری صاحب نے انہیں زبان پر لانا پسند نہیں فرمایا تھا اس لئے ہم بھی ان سے بوجہ آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مودودی صاحب وہاں سے منتقل ہو کر لاہور چلے گئے۔ یہ چوہدری صاحب کی کشادہ نگہی تھی کہ مودودی صاحب نے جب دوبارہ وہاں منتقل ہونا چاہا تو انہوں نے ان کیلئے

دارالاسلام کے دروازے کھول دیئے۔ لیکن حضرت علامہؒ کی وفات کی وجہ سے دارالاسلام کی اسکیم جس طرح خواب پریشان بن کر رہ گئی اس سے چوہدری صاحب سخت دل برداشتہ ہو گئے ۔۔۔ اور ایسا ہونا عین تقاضائے فطرت تھا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ دارالاسلام کے جسد بے روح کو بھی وہیں چھوڑ کر پاکستان تشریف لے آئے، اور (پہلے خوشاب اور اس کے بعد) جوہر آباد میں عزلت نشین ہو کر بیٹھ گئے (دارالاسلام میں البتہ ایک دینی مدرسہ قائم ہے)۔ وہ کبھی کبھی یہاں تشریف لاتے تو پرویز صاحب کے ساتھ پرانی یادوں کے دبستان کھل جاتے۔ کچھ عرصے سے ان کی طبیعت ناساز چلی آ رہی تھی۔ کچھ تو عمر کا تقاضا تھا، اور اس کے ساتھ اپنی مقدس آرزوؤں کی پامالی۔ وہ ان جانکاہ حوادث کی تاب نہ لا سکے۔ ۲۵ فروری کو اطلاع موصول ہوئی کہ چوہدری صاحب انتقال فرما گئے۔ پرویز صاحب اس خبر کو سن کر نڈھال ہو گئے۔ انہوں نے چوہدری صاحب کے فرزند گرامی کے نام تعزیتی تار میں کس قدر صحیح کہا ہے کہ چوہدری صاحب عہد اقبالؒ کی آخری یادگار تھے۔ انکی وفات سے اس عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ اور خود پرویز صاحب سے ان کا زندگی بھر کا ایک مخلص و مشفق رفیق چھن گیا۔

چوہدری صاحب (مرحوم و مغفور) پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کردار کی ایک درخشندہ مثال تھے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کے فدائی اور اقبال کے شیدائی۔ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی خاطر ہر قربانی کے لئے ہر وقت تیار۔ دارالاسلام کی (بستی ہی نہیں، ایک جاگیر) ان کے بے لوث جذبۂ ایثار کی زندہ و تابندہ مثال ہے۔ تقسیم ہند کے عواقب میں رونما ہونے والے حوادث میں ان کا مسکن (قلعہ جمال پور جو دارالاسلام سے ملحق تھا) اردگرد کے علاقہ کے مظلوم و غیر محفوظ مسلمانوں کے لئے امن و سلامتی کا حصار بن گیا تھا۔ انہوں نے اس پیرانہ سالی میں، اس درماندہ کارواں کی جس ہمت اور جرأت سے پرورش کی، اس کی مثال بہت کم ملے گی ۔۔۔ اور یہ سب کچھ اس طرح کہ ۔۔۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی امید ۔۔۔ اس قسم کا صاحب ایثار و خلوص کسی زندہ قوم میں ہوتا تو ساری قوم اس کا سوگ مناتی۔ لیکن اس احسان فراموش قوم سے اس کی کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ چوہدری صاحب عمر بھر اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ کے ایمان افروز مسلک کے پابند رہے اس لئے ان کی خدمات کا صلہ انہیں اللہ کے ہاں سے ملے گا۔ طوبیٰ لہٗ و حسن مآب!

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

اور ۔۔۔ اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر۔